# سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ

## سوانح و افکار

شورش کاشمیری

قال اللہ تعالیٰ فی القرآن المجید
بسم اللہ الرحمن الرحیم
ما كان محمد
ابا احد من رجالكم
ولكن رسول الله وخاتم النبيين
محمد باپ نہیں کسی کا تمہارے مردوں میں، لیکن رسول ہے اللہ کا اور مہر سب نبیوں پر
Muhammad is not the father of any one of your men, but the
Messenger of ALLAH (God) and the Seal upon all the Prophets.
قال النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
انا خاتم النبيين لا نبي بعدي
میں "خاتم النبیین" ہوں، میرے بعد کوئی نبی نہیں

# شروع کی بات

اس کتاب کے لکھنے کا خیال فسادات پنجاب کی انکوائری کمیٹی کے مختلف اجلاسوں (از یکم جولائی ۱۹۵۳ء تا فروری ۱۹۵۴ء) کی کارروائی سے پیدا ہوا جب رپورٹ چھپی تو یہ خیال اور بھی پختہ ہو گیا۔

اس کی دو وجہیں تھیں۔

اولاً : ان لوگوں کا طرز عمل جو بزعم خود علما کے استخفاف پر قہقہے اڑا رہے تھے۔

ثانیاً : پولیس افسروں کی یادداشتوں کا وہ حصہ جس میں شاہ جی کی ذات کو زیر بحث لایا گیا تھا۔

میں نے "چٹان" میں علما کی اہانت کے خلاف اسی وقت احتجاج کیا تھا۔ باوجودیکہ میں نے اپنی سیاسی زندگی کے بہت سے لیل و نہار داعیان شریعت کی ہمراہی میں بسر کیے ہیں لیکن نہ تو میرا نقطۂ نگاہ ان سے موافق رہا نہ میں نے حیات مستعار کے پیراہن میں منبر و محراب کا کوئی پیوند قبول کیا اور نہ شرعی برہمنوں کو مافوق البشر سمجھا —— مجھے شکایت یہ تھی کہ بغیر امتیاز علماء کے خلاف جو باتیں کہی جاتی ہیں ان کی نمایت سے قطعی مختلف ہوتی ہے جو ظاہراً بیان کی جاتی ہے۔ کس گروہ میں کالی بھیڑیں نہیں ؟ کیا ارباب سیاست کی جماعت اس سے خالی ہے ؟ لیکن گالی دینے کے لئے ہمیشہ علما ہی کو نشانے پر رکھا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ سیاسی سازش کے تحت بعض مقدس الفاظ بھی ذلیل کیے گئے ہیں۔ مثلاً یار غار، خلیفہ، ملّا، زید، بکر، عمر۔

اس سازش سے جس بدگوئی کا سراغ ملتا ہے اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں لیکن حیرت ہوتی ہے کہ ان کا استعمال روزمرہ ہو گیا ہے۔

مُلّا کے خلاف طعن و تشنیع کی گرم بازاری بے شبہ سیاسی وجوہ سے ہے۔ بعض شب کور نقادوں نے اپنی نفسی کوتاہیوں کا جواز پیدا کرنے کے لئے نہ صرف مُلّا کو ہدفِ تنقید بنایا بلکہ اس کی آڑ میں ان صلحائے اُمت کو بھی رگید ا جن کا تنہا قصور یہ تھا کہ وہ انگریزی حکومت اور اس کی بیوروکریسی کے خلاف لڑتے رہے۔ جن علما نے تکفیر المسلمین میں ظالمانہ حصہ لیا ان کے خلاف سیاست دانوں میں کبھی مزاحمت یا مدافعت کی کوئی آواز نہیں اُٹھی مگر جن علما نے قربانی و ایثار کی زندگی بسر کی یا یورپی دانشوروں کی اس کھیپ کو اس کے اعمال و افعال پہ ٹوکا ان کے خلاف سب و شتم کے بازار میں ہمیشہ ہی رونق رہی ہے۔ ۱۹۷۰ء میں پاکستان کے عام انتخابات میں یہ بات پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی۔

شاہ جی کے خلاف سرکاری یادداشتوں کی حیثیت محض تعفن کا ڈھیر ہے۔ اس کی سڑاند کا تقاضا تھا کہ اصل حقیقت بے نقاب ہو۔ میرا خیال تھا کہ وہ اہل قلم جنہوں نے شاہ جی کی رفاقت میں عمر کا بڑا حصہ بسر کیا۔ اس فرض سے عہدہ برا ہوں گے لیکن چاروں طرف طویل سناٹا چھایا رہا۔ جن لوگوں نے میری اس کتاب کے عرصہ بعد شاہ جی کے سوانح پر قلم اٹھایا انھیں نزدیکانِ بے بصر کہنا انسب ہوگا۔

میں اپنے سوانح اسیری بہ عنوان "پسِ دیوارِ زنداں" لکھنے میں مشغول تھا۔ بعض دوستوں نے مجبور کیا کہ جوابی تصریحات لکھوں لیکن اولاً رپورٹ کا محاسبہ میرے بس کا روگ نہ تھا۔ ثانیاً تحریک کے پس منظر میں جو گل کھلے تھے ان کے پیشِ نظر کچھ عرصہ توقف و انتظار زیادہ مناسب تھا۔ بہرحال میں نے شاہ جی کی سوانح عمری لکھنے کا قصد کیا۔ اب جو حالات فراہم کرنے شروع کئے تو سب سے بڑی روک خود شاہ جی تھے یا بعض ایسے دوست جن سے بہت کچھ معلوم ہو سکتا تھا لیکن وہ تعاون کے لئے آمادہ نہ تھے اسی اثنا میں بعض ناشدنی باتیں مجھ تک پہنچیں میں

آب وہوا پھیل گئی ہے۔ وہ عام لوگوں کی طرح اس دور کو ترقی کا دور نہیں کہتے تھے بلکہ ان کے نزدیک یہ خسران کا دور تھا اور تحریر اس خسران کی پیچ دار بنیادوں میں سے ایک تھا۔

"بھائی میرے حالات لکھ کر کیا کرو گے" ——— مولانا ابوالکلام آزاد نے "تذکرہ" میں ابوطالب کلیم کی زبانی اپنی ہی نہیں، ہماری بھی سرگذشت لکھ دی ہے۔

بدنامیٔ حیات دو روزے نہ بود بیش

آں ہم کلیم با تو چگویم چساں گذشت

یک روز صرف بستن دل شد بایں وآں

روزے دگر بکندن دل زیں وآں گذشت

تفصیل طلب کی تو مسکرا دیئے، "آغا فہمیدیم اور بس" ——— لیکن مولانا ابوالکلام آزاد سے ان کا روپ قطعی مختلف تھا۔ مولاناؒ اپنے سے باہر جھانکتے نہیں تھے اور شاہ جی نے اپنے کو دیکھنے کی کبھی کوشش نہ کی تھی، مولاناؒ کے لئے تخلیہ صحبت عیش تھا شاہ جی کے لئے جان کنی۔ مولاناؒ کتابوں کی رفاقت کے بغیر زندگی کا تصور ہی نہ کر پاتے تھے، شاہ جی نے عمر بھر کتابوں کی گرد بھی نہیں جھاڑی تھی۔

ما قصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم

از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

یہاں لاہور میں ان کی آزردگی بڑھتی ہی گئی۔ ہر روز ایک نیا سانحہ! پہلے انہیں ہندوستان کی بربادی کا غم تھا اب وہ مسلمانوں کے لئے بے چین تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو تیاری کے بغیر ایک ایسی آگ میں جھونک دیا گیا ہے جس کا واحد نتیجہ ہمہ گیر تباہی ہے۔ وہ کلکتہ، نواکھالی اور بہار کے حالات سے پہلے ہی مغموم تھے۔ اب جن حالات میں خضر وزارت کا استعفیٰ ہوا تھا اور اس استعفیٰ سے پہلے مسلم لیگ نے جو مظاہرے اور مجاہرے کئے تھے شاہ جی کی طبیعت پر ان کا ایک منفی اثر تھا۔ فسادات جنگل کی آگ تھے اور وہ انسانی خون کا تماشا دیکھ ہی نہ سکتے تھے فرماتے:

"ہاں بھائی انگریزوں کا مفاد اسی میں ہے کہ بستیاں کوئلہ ہو جائیں، لوگ قتل ہوں۔ آخر جاتے سے پہلے فرنگی بابا آزادی کی قیمت لے کر ہی جائے گا۔ تم نے آزادی مانگی تھی یہ لو آزادی ——— ؟ یہ اس کی پہلی قسط ہے"۔

شاہ جی! سیاست؟

"ہاں میں جانتا ہوں، سیاست کے معنی ہیں مکر، کلام اللہ میں بھی یہی معنی بیان ہوئے ہیں۔ میں نے لفظ سیاست سے زیادہ کوئی شریر لفظ نہیں دیکھا۔ یہ خدع و فریب کے ایک ایسے اجتماعی کاروبار کا نام ہے جس سے بابو لوگ اغراض کی دکان چمکاتے ہیں"

اور میں جی ہی جی میں سوچ کر چپ ہو رہتا کہ

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو

بظاہر یہ باتیں بے وزن تھیں۔ جس شخص کی نصف زندگی خود سیاست میں گذری ہو جس نے "قبرستانوں" میں "اذانیں" دی ہوں۔ اس کا سیاست کے بارے میں یہ ذہن ایک لطیفہ تھا۔ یہ ذہن انہوں نے تحریکِ خلافت کے بیٹھ جانے پر زعمائی کہ توت سے متاثر ہو کر قائم کیا تھا اور اس پر سختی سے قائم تھے۔ تقسیم ملک کے بعد تو وہ سیاست ہی کو منکرات میں سے سمجھتے تھے گو تحریک خلافت کے بعد بھی انہوں نے سیاست میں وافر حصہ لیا لیکن اپنی مرضی سے کم دوسروں کی مرضی سے زیادہ۔ ان کا ایک خاص معیار تھا جس سے حالات کے بجائے افراد کا جائزہ لیتے۔ انہیں اس سے غرض نہ تھی کہ حالات کیا کہتے ہیں ان کے لئے بس یہ کافی تھا کہ احباب کیا کہتے ہیں، جب تک دوست ان کے اعتماد کو مجروح نہ کریں وہ ان کے دماغ سے بھی سوچ لیتے، ملک کی سیاسی تحریکوں کے اٹھانے میں ان کے دماغی فیصلے شاذ ہی شریک ہوتے لیکن ان تحریکوں کے جگمگانے میں ان کی زبان برقی لہر ثابت ہوتی۔

وہ سب سے بڑے عوامی خطیب تھے لیکن عوام کو کالانعام ہی سمجھتے۔ انہیں جدید سیاسی اصطلاحوں سے کوئی رغبت نہ تھی، ان کا خیال تھا کہ تحریکات میں عوامی قوت فعال ضرور ہوتی

ہے لیکن سرچشمہ نہیں۔ وہ نتائج کو مشیت ایزدی کے تابع سمجھتے تھے ان کی بے نیازی حد سے بڑھی ہوئی تھی، انہیں اخبارات سے نفرت تھی ان کا عقیدہ تھا کہ اخبارات نے آغاز سے اب تک بڑے بڑے جھوٹ گھڑے ہیں، اگر اس جھوٹ کا بوجھ ماؤنٹ ایورسٹ پر پڑتا تو وہ زمین میں دھنس چکی ہوتی۔ انہیں اشتہار دینے یا بننے سے سخت نفرت تھی۔ ایسی کوئی ترغیب یا تحریص انہیں بہلا یا پھسلا نہ سکی اور نہ وہ خوشامد ہی سے رام ہوتے۔ ان کے نزدیک یہ انسان کی ملعون کمزوریاں تھیں۔ یہاں بڑے بڑے تخلیہ دوست رہنما اور گوشہ نشین مہاتما بھی اخباروں میں چھپنے کی آرزو سے بے نیاز نہ رہ سکے لیکن شاہ جی غالباً تنہا انسان تھے جنہیں اس کوچے سے رسم و راہ رکھنے میں عار تھی، وہ غصہ میں اکثر اس کو جہنم کی آگ کہہ اٹھتے اور ہمیشہ اس سے کنی کتراتے رہے۔

"بابو! میں اس میدان کا کھلاڑی نہیں"

جب کسی فوٹو گرافر نے ان کی تصویر لینا چاہی تو چہرے پر رومال ڈال لیا یا ڈانٹ کر بٹھا دیا، کیا کرتے ہو میاں؟ یہ میری تصویر بنا کر کیا کرو گے؟ میری تصویر میرے افکار ہیں، میرے خیالات کو اتار سکتے ہو تو دل کے فوکس میں اتار لو یہ سب سے اچھی تصویر ہوگی۔ دنیا میں نہ سہی عاقبت میں کام آئے گی اور ہاں میری تصویر ——؟

بیٹا پاس بیٹھا ہو تو اس سے کہتے "کھڑے ہو جاؤ شاہ جی!"

فوٹو گرافر سے مخاطب ہو کر،

"میری تصویر میرا یہ بیٹا ہے اس کو دیکھ لو۔"

"اور ہاں میری نظر سے دیکھنا! کتنی اچھی تصویر ہے؟"

خود عمر بھر میں ایک آدھ تصویر کھنچوائی، اس کے علاوہ دو چار تصویریں اور ہوں گی لیکن سب چوری چھپے کی، وہ تصویر کا رکھنا اور کھنچوانا شرعاً ممنوع سمجھتے تھے۔ انہیں مصوری، عکاسی کی خلقی اور غیر خلقی بحثوں سے کوئی واسطہ نہ تھا وہ انہیں کٹ حجتی سمجھتے۔ عرض کیا کہ

فلاں فلاں بزرگ کی تصویر بن چکی ہے مثلاً مولانا ابوالکلام آزادؒ (جن سے شاہ جی کو خصوصی ارادت تھی) فرماتے:

"تم ٹھیک کہتے ہو لیکن میں سیاست میں ان کا مقلد تھا۔ شریعت میں نہیں۔ میرے لئے ان کا کوئی فعل حجت نہیں، بابو! میرے میاں (صلی اللہ علیہ وسلم) نے منع فرمایا ہے ان کے قول کے بعد سب اقوال ہیچ ہیں۔"

اور وہ میاں کے لقب سے حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم (فداامی وابی) کا نام لیتے اور ذکر کرتے تھے۔

راقم نے عرض کیا:

"شاہ جی! آپ تو کرتے کے ساتھ شلوار پہنا کرتے تھے لیکن یہ کچھ دنوں سے آپ نے تہبند پہننا شروع کر رکھا ہے؟ فوراً ہی بات کاٹ لی:

"بھائی حضور کا لباس ہے، میاں پہنتے تھے۔"

ظاہر ہے کہ اس جواب کے بعد ہر سوال ختم ہو جاتا، شاہ جی کی دو تہائی زندگی سیاسیات میں کٹی، ہندوستان کا کونہ کونہ چھان مارا، ان دنوں کے سوا جو قید خانے میں بسر ہوئے کوئی دن بھی تقریر کے بغیر نہ گذارا، سیکڑوں قومی و ملکی مسائل پیدا ہوئے اور ہر مسئلے میں لوگوں سے کہا سنا لیکن اخباروں میں بیان بازی سے ہمیشہ گریز کیا۔ جہاں اور جب نامہ نگاروں نے گھیرا دامن چھڑا لیا، تمام عمر کسی عنوان سے اخبارات میں کوئی بیان نہ دیا۔ اس اعتبار سے ان کی زندگی میں ایک دلچسپ خموشی تھی۔ مجلسِ احرار نے اپنا اخبار جاری کیا لیکن وہاں بھی کبھی کوئی بیان نہیں چھپوایا جو بیان یا پیغام ان سے منسوب ہیں ان میں بھی ان کی منشا تھی، قلم نہیں، راقم کے علم میں صرف ایک مثال ایسی ہے جو اس سے مستثنیٰ ہے اور وہ ایک خط ہے جو پاکستان بن جانے کے بعد روزنامہ "آزاد" میں ان کے قلم سے نکلا۔ تقریباً تمام بڑے ایڈیٹروں سے ان کے تعلقات رہے، لیکن چھپنے چھپانے سے فرار ہی کیا۔ کسی نامہ نگار نے گھیر لیا، کوئی سٹاف رپورٹر آنکلا

یا کسی نمائندے سے ٹکر ہو گئی اور وہ سوال کر رہا ہے، شاہ جی فلاں مسئلہ میں آپ کا کیا خیال ہے؟ شاہ جی کنی کترا کے نکل جاتے، فرماتے:

"بھائی میں آجکل قرآن مجید کی فلاں آیت پر غور کر رہا ہوں، میرا خیال ہے فلاں فلاں مفسر نے اس بارے میں ٹھوکر کھائی ہے البتہ شاہ عبد القادر کے ترجمہ میں بات اُبھرتی ہے، مولانا ابو الکلام آزاد کی تفسیر سامنے نہیں، غالباً انہوں نے بھی ان سے اتفاق کیا ہے۔"

اخبار نویس پوچھتا ہے:

"دو قومی نظریئے کے مسئلے میں آپ علامہ اقبالؒ سے متفق ہیں یا مولانا حسین احمد مدنی سے؟ آپ نے بحث تو دیکھی ہو گی؟ بھائی میں نے جانبین کے فرمودات کا مطالعہ ہی نہیں کیا۔ آج کل بیاض کھنگالنے میں لگا ہوں۔ کوئی ۳۵ برس پہلے "جب آتش جوان تھا" یہ بیاض مرتب کی تھی۔ سنو یہ شعر کس قدر پیارا ہے۔

ہر کسے را دامن تر ہست اما دیگراں
باز می پوشند و ما در آفتاب انداختیم

اخبار نویس کہتا ہے "شاہ جی عالمی وفاق کا قیام ممکن ہے؟ جمہوریت اس وفاق کا ذریعہ بن سکتی ہے یا فسطائیت یا اشتمالیت؟

شاہ جی موڈ کے آدمی تھے یہ سوچنے کی مہلت ہی نہ دیتے کہ انہوں نے عصری تحریکوں کا مطالعہ کیا ہے یا نہیں؟ ان کے نزدیک ہر چیز کی ایک ہی ترازو ہے اور وہ ہے قرآن مجید اسوۂ رسولؐ، سیر صحابہؓ اور علمائے اُمت کا فہم و تدبر۔ ان ائمہ اربعہ کے سوا جن کی فقہ چلتی ہے وہ کسی جدید فقہ کے قائل نہ تھے، ان کا واحد معیار اسلام تھا۔ اس دور کی بیشتر تحریکیں ان کے نزدیک ذہنی بدکاری تھیں۔ انہوں نے سرے سے ان تحریکوں کا مطالعہ ہی نہ کیا تھا۔ ان کے بارے میں ان کی معلومات محدود اور بالواسطہ تھیں؟ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی

کہ وہ انگریزی بالکل نہیں جانتے تھے اور عصری تحریکوں کا علم انگریزی میں رسوخ کے بغیر حاصل نہ ہوتا تھا۔ گو ایک حد تک انگریزی زبان کے مزاج سے آشنائی بھی اس خلا کو پورا کرتی ہے لیکن شاہ جی دونوں سے دست کش تھے۔

ان کا تعلق دیوبند کے اس مدرسۂ فکر سے تھا جس نے انگریزی پڑھنا پڑھانا حرام قرار دیا تھا وہ دیوبند کے فارغ التحصیل نہیں تھے لیکن ان کی ذہنیت کا خمیر اسی خاک سے اُٹھا تھا جن اکابر علماء نے سرسید کے مشن کی مخالفت کی وہ ان پر ہزار ہزار رحمتیں بھیجتے۔ ان کے عقیدہ میں خرابی کی اصل جڑ انگریزی تعلیم تھی جس نے مسلمانوں کے بدن سے "روحِ محمدؐ" نکال لی اور انہیں مغربی افکار کے حوالے کر دیا تھا۔ ان کا خیال تھا اس خرابی کو ابتداً روک لیا جاتا تو آج نقشہ مختلف ہوتا اور مسلمان اس طرح نہ گرتے جس طرح گر چکے ہیں پھر ان کا یہ خیال معناً درست تھا کہ زبان کے بدلنے سے انسان بدل جاتا ہے۔ مثال کے طور پر عربوں نے جن ملکوں کو فتح کیا وہاں کی زبان عربی بنا ڈالی اور عام باشندے اسلامیات میں گھل مل گئے۔ جہاں عربی زبان کا تسلط نہ ہوا وہاں جہانبانی کی مدت گزرتے ہی عمارت بیٹھ گئی۔ ہندوستان کی نظیر سامنے ہے۔ یہاں اسلام حکمرانوں کی معرفت نہیں بلکہ اہل اللہ کی وساطت سے آیا لیکن عام آبادی میں اسلامی فکر رچ بس نہ سکی۔ عربی اثر سے قاہرہ ہمیشہ کے لئے اسلام کا شہر ہو گیا لیکن دہلی مسلمانوں کی طویل حکمرانی کے باوجود اس شرف سے محروم رہا۔ جن مسلمان خاندانوں نے ہندوستان میں حکومت کی ان کا اسلام کئی واسطوں سے متاثر تھا وہ اسلام کی اصل زبان ہی سے ناآشنا تھے۔ فارسی کو مسلمان ہونے میں دیر لگی، لیکن قبول اسلام کے باوجود اس میں عجمی رنگ برقرار رہا۔ اس کی کوکھ سے اُردو پیدا ہوئی جس نے خاص قسم کے اثرات پیدا کئے باوجودیکہ اس زبان کے بنانے اور بولنے والے مسلمان تھے لیکن زبان مسلمان ہو گئی۔ اسلام اُردو نہ ہو سکا۔ انگریزی کا معاملہ ہی دوسرا تھا۔ اولاً نصاریٰ کی زبان، ثانیاً فاتحوں کی بولی، ثالثاً اسے وہ لوگ لے کر آئے تھے جو کلیسا کے ردِ عمل سے نفس مذہب کے خلاف اُبھرتی ہوئی تحریکوں کے ہراول تھے۔

صدیہ کہ صنعتی انقلاب نے زبان کا مزاج ہی بدل ڈالا ـــــــ ان حالات میں جن علماء نے مسلمانوں کو انگریزی تعلیم سے روکا اور ان میں اس کے خلاف ایک عمومی تحریک کی نیو اٹھائی۔ ان کے ذہن میں یقیناً حالات کی خرابیوں کا یہ نقشہ ہوگا لیکن اب دنیا ایک صدی آگے بڑھ چکی ہے اور آج انگریزی کو دنیا میں وہی عروج حاصل ہے جو کبھی عربی کو تھا۔ پھر انگریزی محض ایک زبان ہی نہیں رہی بلکہ سائنسی انکشافات کی طرح ناگزیر ہوگئی ہے لیکن شاہ جی کے نزدیک انگریزی پڑھنا پڑھانا دونوں حرام تھے۔

ایک دفعہ میں نے ان کے بچوں سے متعلق عرض کیا:

"شاہ جی انہیں انگریزی پڑھائیے، انگریزی مدرسوں میں بھیجئے اور ممکن ہو تو وکیل بنائیے آئندہ معاشرے کی باگ ڈور قانون والوں کے ہاتھ میں ہے"۔

بس اس پر بگڑ گئے۔

"تم یہ کیوں نہیں کہتے کہ انہیں زندہ دفنا دو ـــــــ لعنت بر پدرِ فرنگ"۔

اور یہ ان کا قلندرانہ نعرہ تھا۔

کمیونسٹوں اور سوشلسٹوں کی ایک خاص کھیپ سے ان کے دوستانہ مراسم تھے، ہندوستان ایک تھا تو ان کے نیازمندوں میں بڑے بڑے کمیونسٹ اور سوشلسٹ (ہندو اور مسلمان) شامل تھے۔ ان کی ایک بڑی جمعیت کو ہمیشہ آپ سے لگاؤ رہا، سبھی آپ کا احترام کرتے لیکن نہ وہ انھیں ہم خیال بنا سکے اور نہ یہ انہیں قائل معقول کر سکے۔ دونوں کے درمیان جذباتی رشتہ رہا۔ ان میں سے اکثر آپ کے صحبت یافتہ تھے، مثلاً منشی احمد دین سوشلسٹوں کے سب سے بڑے مقرر تھے ان کا سیاسی راستہ ہمیشہ ہی مختلف رہا لیکن خطابت میں شاہ جی ہی کے خوشہ چین تھے۔

شاہ جی کیونزم کو بھی اسلام کے خلاف یہودیوں کی لامتناہی سازشوں کا ایک حصہ سمجھتے تھے دلیل یہ تھی کہ کارل مارکس یہودی تھا اور یہودی ہمیشہ سے اسلام کے خلاف سازشیں

کرتے آئے ہیں۔ اس ضمن میں وہ اسلام کے خلاف کی گئی سازشوں کی پوری تاریخ اپنے خطیبانہ جوش میں بیان کر جاتے۔ ان کی یہ باتیں نئی نسل کے لیے سطحی ہوتیں یا اجنبی یا پھر جذباتی لیکن ان کا بہاؤ اتنا تیز ہوتا کہ سامعین متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے۔

کارل مارکس نسلاً یہودی ضرور تھا لیکن اس نے انسان کے اجتماعی اور انفرادی دکھ کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ ایک ایسی تحریک کی بنیاد رکھی جس کی اساس جدلیات پر ہے، صیہونیت پر نہیں، مگر شاہ جی تاریخ کی مادی تعبیر، طبقاتی کش مکش، جدلیاتی اصول اور سرمایہ و محنت کے معاشی مباحث کو اپنی خطابت میں کوئی اہمیت نہ دیتے، فرماتے ع

این دفتر بے معنی غرق مئے ناب اولیٰ

جس تحریک یا جماعت میں خدا نہ ہو، اخلاقی قدریں اضافی سمجھی جائیں اور پیغمبر صرف مادی حالات کی تاریخی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے آئے ہوں، شاہ جی اس تحریک یا جماعت کے داعیوں پر غضب ناک ہو کر نکتہ چینی کرتے، عام اشتمالی نوجوانوں کو گمراہ مگر مخلص خیال کرتے لیکن دکاندار علماء کی طرح وہ نہ تو سرمایہ داری کا جواز پیدا کرتے اور نہ بڑی زمینداریوں ہی کے حق میں تھے، فرماتے زمینیں خدا کی ملکیت ہیں اور جو لوگ ان میں ہل جوتتے ہیں وہی از روئے اسلام ان کے حقدار ہیں۔ جس نظام معیشت سے بھی استحصال پیدا ہو وہ اس کے سخت خلاف تھے انہیں خونیں انقلاب برپا کرنے میں کوئی عار نہ تھی، لیکن ان کے نزدیک رہنما "قرآن" تھا "سرمایہ" نہیں۔

دوسری جنگِ عظیم کے دنوں میں دہلی دروازہ لاہور کے باہر حکومت الٰہیہ کے موضوع پر بول رہے تھے۔ جانے کیونکر اشتراکیوں کا ذکر آگیا، کسی نے لقمہ دیا، حضرت ان کا تو عقیدہ ہے کہ زمین سے سرمایہ داری اور آسمان سے خدا کو نکال دو۔ بس پھر کیا تھا، گھنگھریالے بالوں کو جھٹکا دیا، پہلے ہنسے پھر تاؤ میں آگئے۔ "ٹھیک ہے بھائی ٹھیک ہے، ہائے اکبرالٰہ آبادی کس وقت یاد آگئے ——— (لے کے ساتھ)

صدیوں فلاسفی کی چناں اور چنیں رہی

لیکن خدا کی بات جہاں تھی وہیں رہی

کہاں خداوند ایزد متعال کہ "کُن" کے لفظ سے کائنات پیدا کی کہاں روس، توسے پر دانۂ اسپند، الٹا دو تو سور ہو جائے"۔

بات کچھ نہیں محض الفاظ کا الٹ پھیر تھا لیکن اس ایک ادا نے مجمع کو گرویدہ کر لیا، نعرہ ہائے تکبیر گونج اٹھے۔ اس سحر ہی سے خوفزدہ ہو کر ڈاکٹر اشرف نے ایک دفعہ شاہ جی سے کہا تھا "آپ لوگوں پر ایسا جادو کرتے ہیں کہ ان کے سوچنے کی قوتیں ماؤف ہو جاتی ہیں آپ کا علاج گولی ہے"۔

غرض شاہ جی بعض عجیب و غریب خصوصیتوں کا مجموعہ تھے، ان کی باتیں اکثر و بیشتر حقائق پر منتج ہوتیں جب وہ کسی تحریک کے افکار و حالات پر گفتگو کر رہے ہوتے تو سیاسی ترازو میں ٹھیک نہ بیٹھتیں لیکن نتائج کے اعتبار سے اس طرح صورت پذیر ہوتیں کہ لوگوں کو شاہ جی کے ملہم ہونے کا گمان ہوتا۔ ان کی قلندرانہ شوخیاں اکثر و بیشتر حقائق پر منتج ہوتیں۔ یہ درویشی جس سے سیاست کو دور کی نسبت بھی نہ تھی ان لوگوں میں جھنجلاہٹ پیدا کرتی جو سیاست کو مادیات کے آئینے میں دیکھتے تھے لیکن اس جھنجلاہٹ کے باوجود جب نتیجوں کی منزل سامنے آتی تو ان باتوں کا بہت بڑا حصہ صحیح ہوتا۔ خضر وزارت لڑٹی تو ان کی قلندرانہ پیش گوئیاں حرف بحرف پوری ہوتی گئیں۔

چڑھتے دن سے گئی رات تک وہ مکانوں سے اٹھتے ہوئے شعلوں کا نظارہ کرتے، کوئی پوچھ لیتا تو فرماتے:

"میاں کیا پوچھتے ہو یہ شعلے نہیں ٹوانوں کے طرّے ہیں طرّے"۔

شاہ جی نے فسادات کے آغاز ہی میں امرتسر چھوڑ دیا تھا، امرتسر سے کوئی دوست آتا تو اس سے کہتے۔ "وہاں کیا رکھا ہے چلے آؤ جو خط کھنچ چکا ہے وہ اب مٹنے کا نہیں" مجھے

دیکھو سخن متروکہ ہو گیا ہوں کہ

کہ پاؤں توڑ کے بیٹھے ہیں پائے بند ترے

عمر بھر ایک ہندو اور ایک مسلمان اخبار پڑھتے رہے لیکن ان دنوں وہ التزام بھی ٹوٹ چکا تھا۔ اخبار مل گیا، پڑھ لیا۔ نہ ملا تو دوستوں سے خبریں معلوم کر لیں یا ریڈیو سُن لیا۔

ان کی سفری کائنات ایک چھوٹا سا بستر، ٹین کا بیمار بکس، بید کی ٹوکری، تانبے کا لوٹا اور گول سا پاندان تھا۔ کوئی نئی کتاب ہاتھ آگئی تو جب تک پڑھ نہ لی شریک سفر رہی، ان دنوں "غبار خاطر" کا دستخطی نسخہ ہمراہ تھا۔ اس کا مطالعہ شروع کیا تو اپنی کہانی بھی کہنے لگے، حافظہ کی گرہیں کھلنے لگیں انہیں عربی فارسی اُردو، پنجابی اور ملتانی کے بے شمار شعر، مثنویاں، قصیدے، مسدسیں، مخمسیں، نوحے، نعتیں، غزلیں، نظمیں از بر تھیں اور مولانا آزادؒ کی طرح اپنے حافظے پر انہیں بھی بڑا ناز تھا۔

"یہ اشعار آج سے کوئی تیس سال پہلے پڑھے تھے، فلاں شعر شاد عظیم آبادی سے سُنا تھا اب تک یاد ہے، نظیری کے فلاں فلاں شعر ناما مرحوم کے بیاض سے نقل کئے تھے میاں! فارسی کا ذوق تو اب عنقا ہو رہا ہے، ادھر اُردو بھی اب نئے نئے تجربوں کی زد میں ہے۔ شاعری نے ایک نیا بچہ جنا ہے، نظم معریٰ یا نظم آزاد، مرزا غلام احمد کی نبوت اور نظم معریٰ میرے لئے ناقابل فہم ہیں ——— لعنت بر پدر فرنگ!

مدت العمر پنجابی کی شوخ و شنگ شاعری کا شوق رہا۔ لیکن عمر کے ساتھ ہاتھ اُٹھا لیا۔ ایک دفعہ مولانا آزادؒ کو ہیر وارث شاہ کا ایک بند سنایا۔ اس وقت تو مولانا عادتاً "ہاں میرے بھائی" کہہ کر چپ ہو رہے لیکن ۲۵ - ۲۶ برس بعد ملے تو فرمایا "شاہ جی سنا کہ آپ تقریریں گالی دینے لگے ہو؟"

"حضرت، آپ سے کس نے کہا؟"

"میرے بھائی نام تو یاد نہیں آ رہا۔ بہرحال کوئی صاحب ضرور تھے۔"

"تو حضرت آپ نے اعتبار کیا ہے؟"

"میرے بھائی اعتبار کی بات نہیں، ایک زمانہ میں آپ نے ہیر وارث شاہ کے چند شعر سنائے تھے ان میں کچھ ایسے ہی کلمات تھے، میں نے سمجھا شاید زبان لڑکھڑا گئی ہو"
شاہ جی نے قہقہہ لگایا، مولانا نے تبسم فرمایا اور بات ہوا ہو گئی۔

انہیں بلھے شاہ کی کافیاں اور بابا فرید کا کلام بھی خوب یاد تھا بابا فرید کی زبان دوضلعی ہے اور مقابلۃً دشوار۔ بلھے شاہ سریع الفہم ہیں اور ان کے ہاں کھلی صاف گوئی ہے ع

سچ کہندیاں بھانبڑ مچدا اے

"ہاں بھائی سچ کہنا فرنگی کے دور میں بہت بڑا جرم ہے"

"جی نہیں شاہ جی ہر دور میں جرم رہا ہے"

"تم ٹھیک کہتے ہو بھائی لیکن ہمارا معاملہ تو اس دور سے ہے"

میں چاہتا تھا شاہ جی اس موضوع پر کھلیں اور میں ان پر بزعم خود ثابت کروں کہ انسان کو اس دور میں مقابلۃً زیادہ حقوق و مراعات حاصل ہیں اور پہلے تمام دور سیاستہً گھناؤنے اور ڈراؤنے تھے۔ میں نے ان سے کہہ ہی دیا، شاہ جی مسلمان بادشاہوں نے بھی تو راستباز زبانوں کے کاٹنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی؟ آج جن لوگوں کو تاریخ اسلام کی سب سے بڑی شخصیتیں کہا جاتا ہے ان کے ساتھ حکام اور عوام نے ایک سا برتاؤ کیا آج استبداد کی اجتماعی حمایت میں کم سے کم عوام تو شریک نہیں ہوتے؟

"میاں! یہ سب کچھ میں نے بھی پڑھا ہے، تم فرنگی بابا کو نہیں جانتے، اس نے روحیں قتل کر دی ہیں، روحیں! اسلام اٹھ گیا مسلمان رہ گئے۔ ہائے اکبر کس وقت یاد آیا دئیے ہیں)

ع

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

ان کے بھی اکبر الہ آبادی کی طرح احتجاجی لیکن منفی جذبات تھے لیکن دونوں میں

یہی فرق تھا جو ایک مصلح اور انقلابی میں ہوتا ہے۔ اکبر مسکرا کر چٹکی لیتے ہیں شاہ جی جھنجھلا کر تھپیڑ مارتے ہیں۔ ان کے دل میں ہمیشہ کے لئے یہ گرہ پڑ چکی تھی کہ انگریز سے بڑا دشمن اسلام کوئی نہیں۔ ان کے سامنے انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز کی پوری تاریخ تھی۔ انہوں نے سیاسیات میں قدم رکھا تو پہلی جنگ عظیم کے نتائج آنکھوں کے سامنے تھے جو خیالات ورثہ میں پائے وہ استعمار کے مخالف علماء کے خیالات تھے۔ خلافت عثمانیہ جس طرح پارہ پارہ ہوئی اور عرب ملکوں میں قومیت کے نام پر جو گل کھلائے گئے وہ ان کی انگریزوں سے برگشتگی کے لئے کافی تھے۔ ہندوستان میں تحریک خلافت اور جلیانوالہ باغ کے حادثے نے مہمیز کا کام کیا۔ نتیجۃً شاہ جی آتش فشاں پہاڑ کی طرح پھٹ پڑے۔ فرماتے کہ قاسم نانوتوی اور محمود الحسن رحمہم اللہ تعالیٰ نے جو راستہ دکھایا ہے آخرت کی فکر میں اسی پر چل رہا ہوں مجھے اسی کے لئے جینا اور اسی پر مرنا ہے۔

حرف ناگفتہ مجال نفسے مے خواہد
ورنہ ما را بہ جہاں تو سر و کار کجاست

الغرض ان کی ذات ربع صدی تک انگریزوں کے خلاف ایک تحریک بنی رہی۔ اس لحاظ سے وہ ایک ادارہ تھے۔ انہوں نے ایسے علاقوں میں انگریز دشمنی کے بیج بوئے جہاں ان کے اپنے الفاظ میں اور گو یہ الفاظ کسی قدر سخت ہیں "پنجابی مائیں بڑی چاہت سے ٹوڈی بچے جنتی تھیں۔"

ایک دوست نے دریافت کیا "ملکی سیاسیات میں آپ کی کارگزاری (Contribution) کیا ہے اور آزادی ہندوستان کا وہ کون سا مثبت نظریہ ہے جس کے لئے آپ کوشاں ہیں؟"

فرمایا، "یہ فیصلہ تو آپ کیجئے کہ میری (Contribution) کیا ہے، میں تو یہ جانتا ہوں کہ میں نے لاکھوں ہندوستانیوں کے ذہن سے انگریزوں کو نکال پھینکا۔ میں نے کلکتہ سے خیبر تک اور سرینگر سے راس کماری تک دوڑ لگائی ہے وہاں پہنچا ہوں جہاں

دھرتی پانی نہیں دیتی۔ رہا یہ سوال کہ آزادی کا وہ کونسا تصور ہے جس کے لیے میں لڑتا رہا تو سمجھ لیجئے کہ اپنے ملک میں اپنا راج۔ آپ غالباً مجھ سے کسی کتابی آئیڈیالوجی کا پوچھ رہے ہوں گے؟ بابو ــــ یہ کتابی نظریے عموماً روگ ہوتے ہیں، فی الحال جو مرحلہ درپیش ہے وہ کسی مثبت تصور کا نہیں، منفی تصور کا ہے، ہمارا پہلا کام یہ ہے کہ غیر ملکی طاقت سے گلوخلاصی حاصل ہو۔ اس ملک سے انگریز نکلیں۔ نکلیں کیا؟ نکالے جائیں، تب دیکھا جائے گا کہ آزادی کے خطوط کیا ہوں گے؟ آپ تو نکاح سے پہلے چھوہارے بانٹنا چاہتے ہیں۔ پھر میں کوئی دستوری نہیں سپاہی ہوں، تمام عمر انگریزوں سے لڑتا رہا اور لڑتا رہوں گا۔ اگر اس مہم میں سور بھی میری مدد کریں تو میں ان کا منہ چوم لوں گا۔ میں تو ان چیونٹیوں کو شکر کھلانے کے لئے تیار ہوں جو "صاحب بہادر" کو کاٹ کھائیں۔ خدا کی قسم میرا ایک ہی دشمن ہے انگریز۔ اس ظالم نے نہ صرف مسلمان ملکوں کی اینٹ سے اینٹ بجائی، ہمیں غلام رکھا اور مقبوضات بیدا کئے بلکہ خیرہ چشمی کی حد ہوگئی کہ قرآن حکیم میں تحریف کے لئے مسلمانوں میں جعلی نبی پیدا کیا، پھر اس خود کاشتہ پودے کی آبیاری کی اور اب اس کو چہیتے بچے کی طرح پال رہا ہے۔"

ان کی اس جھنجلاہٹ میں ایک قسم کی جارحانہ لگن ہوتی جو باتیں اقبال نے قلندرانہ رنگ میں کہی ہیں اور جن میں "پیچ وتاب رازی" اور "سوز وساز رومی" کی شدت پائی جاتی ہے شاہ جی ان کے انتھک مفسر تھے، اقبال واکبر کی مثالیں یہاں اس لئے زیر قلم آئی ہیں کہ قارئین شاہ جی کی سیرت کے اس پہلو کو آسانی سے سمجھ لیں۔

اکبر اور اقبال دونوں کا مشن ایک تھا، لیکن دونوں کا طرز بیان، مقاصد میں ہم آہنگی کے باوصف مختلف رہا۔ اقبال کا انداز عقلی ہے، اکبر کا جذباتی ــــ اکبر نے ایک گرتی ہوئی دیوار سے دل برداشتہ ہوکر گردوپیش کے ظواہر پر سنگ دلانہ قہقہے لگائے تھے لیکن اقبال اس دور کی تمام عصری تحریکوں کے نقاد تھے وہ انگریزوں کے صرف اسی لئے مخالف نہیں تھے کہ انہوں نے کسی مدرسۂ فکر سے عقیدے کے طور پر بعض معلوم سچائیاں حاصل کی تھیں ان کی

انگریزوں پر چوٹیں ایک مسلسل مطالعے اور لگاتار مشاہدے کا نتیجہ تھیں۔ مثلاً ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

کرے قبول اگر دین مصطفےٰ انگریز
سیاہ روز مسلماں رہے گا پھر بھی غلام

گویا اقبال کے علم و نظر کی معراج اس خیال پر ختم ہوتی ہے جس خیال کو شاہ جی کے ہاں قریب قریب عقیدہ کا درجہ حاصل تھا اور جو جذبہ سے شروع ہو کر جذبہ ہی پر ختم ہوتا تھا۔

شاہ جی کا یہ جذباتی سراپا انتہائی دلآویز تھا انہوں نے برطانوی حکومت کے خلاف اپنی جدوجہد کی بنیاد محض اس اصل پر نہیں رکھی تھی کہ وہ ایک استعماری قوت تھی، اس کا نوآبادیاتی نظام استحصالِ محض تھا اور وہ دنیا کے سب سے بڑے سامراج کی مظہر تھی۔ ان کی بنیاد مخاصمت میں کچھ اور باتیں خاص طور پر نمایاں تھیں مثلاً :

"۱۸۵۷ء کا غدر اور وہ اسے "غدر" کہنے والوں کو غدار کہتے۔ بہادر شاہ ظفر کی جلاوطنی، شہزادوں کا خونی دروازوں پر لٹکایا جانا، آزاد قبائل کے پٹھانوں پر انگریزوں کی مسلسل بمباری، گیلی پولی کے مقام پر مصطفےٰ کمال کے خلاف گھڑوں، لڑائیوں اور فوجوں کی نبرد آزمائی، قسطنطنیہ کے بازاروں میں خلیفۃ المسلمین کی بیٹی کا بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا جانا، غلافِ کعبہ کا جلنا، مہدی سوڈانی کا خرطوم کے صدر دروازے پر سولی پانا، اس کی لاش کا جلایا جانا اور راکھ کا اُڑانا، شاہ عبدالقادر جیلانی کے بغداد پر گولہ باری اور حرم کے کبوتروں کا زخمی ہونا ——" ان سانحات کو قرآن و حدیث کا رنگ و روغن دے کر اس طرح بیان کرتے کہ ہزارہا لوگ گھنٹوں دم بخود بیٹھے رہتے اور ان کے اعجاز بیان پر سر دھنتے تھے۔

"شاہ جی اپنی سوانح عمری ہی لکھیے؟"

"کس کے لیے؟"

"ہمارے لیے۔"

جن کے ہاں دل و دماغ کا قحط تھا، جن کی پستیاں انتہائی خطرناک تھیں جو برف کی طرح ٹھنڈے تھے جن میں ٹھہرنا المناک اور جن سے گزر جانا طرب ناک تھا، جن کے سب سے بڑے معبود کا نام طاقت تھا جو صرف طاقت کی پوجا کرتے تھے، تیرہ سو برس کی تاریخ انہی حادثوں کی کہانی ہے، انہی چھچھورے، ناسمجھ، نازک اور متحرک جانوروں کو دیکھ کر زرتشت نے کہا تھا کہ اس کا آنسوؤں اور گیتوں کی طرف میلان ہوتا ہے ——— یہاں امراء دوزخ کے کتے اور سیاست دان کھٹمل ہیں، ان کے ساتھ نٹ اور ان کے پیچھے لاشیں چلتی ہیں ان کی واحد خوبی یہ ہے کہ ہر نیکی اور ہر برائی کی زبان میں جھوٹ بول لیتے ہیں۔"

میاں بابو! ڈھونڈ سکتے ہو تو ان افکار میں میری سوانح عمری کی بنیادیں ڈھونڈ لو ع

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا

اور نظریہ ظاہر گرامی کا یہ مصرع بھی اسی اجمال کی شرح ہے ع

زدی کشتی شکستی سوختی انداختی رفتی

الغرض انہیں اپنی ناکامیوں کا شدید احساس تھا اور اس آزردگی کے آثار آخر عمر میں ان کے چہرے پر آگئے تھے، ان کی متحرک اور روشن آنکھیں جن میں عمر ڈھلنے تک ساری مستی شراب کی سی تھی بالآخر اندر کو دھنس گئی تھیں، ان کے ماتھے کی بے شمار سلوٹوں میں ہزیمت کی ترشی منجمد ہوگئی تھی اور سلوٹیں اپنے ماضی کے بوجھ سے مضمحل تھیں، آواز میں کرارا پن آخر تک رہا لیکن کمر کی خمیدگی پکار رہی تھی ع

لگا کے آگ مجھے کارواں روانہ ہوا

۱۹۴۷ء کا زمانہ رستخیز۔ سب سے طویل عرصہ تھا جو انہوں نے ایام قید سے قطع نظر ایک ہی جگہ نشست جما کر بسر کیا، چند ماہ دفتر احرار میں رہے اور اس اثنا میں کتاب کے جتنے ورق تھے ایک ایک کر کے کھل گئے۔ وہ اپنی کہانی لکھتے تو حقیقتہً بڑے بڑے وقائع نگاروں کا اثاثہ مفلس کا چراغ ہو جاتا، انہوں نے ہندوستان کا ہر کونہ کھدرا چھان مارا۔

ہو گئے ، پھر بیعت وارشاد کے سلسلے میں دہلی سے پٹنہ چلے گئے اور وہاں لوگوں کی عقیدت مندی کے باعث سکونت اختیار کرلی۔ فی الجملہ ایک خاندان کئی شاخوں میں منقسم ہوگیا۔

شاہ جی کے فرزند ارجمند سید ابوذر بخاری (سید عطاء المنعم بخاری) نے اپنے والد کے مجموعہ کلام "سواطع الالہام" میں دیباچہ کے تحت خاندان کے حالات پر جو اشارات مرتب کئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خاندان میں بڑے بڑے لوگ گزرے ہیں، مثلاً شاہ عبدالقادر جیلانی (البغدادی) جنہیں عراق میں پیر ہندیاں کہتے ہیں اور یہاں ان کے نام سے گیارہویں شریف ہوتی ہے۔

سید اکمل الدین محمد بخاری اس خاندان کے پہلے فرد تھے جو تلاش مرشد کے سلسلہ میں دہلی گئے اور وہاں سید غلام علی شاہؒ سے بیعت ہو کر خرقہ خلافت حاصل کیا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانہ میں ضلع گجرات موضع سرہالی پنجاب میں آباد ہو گئے۔ انگریزی عملداری کے وقت نقل مکانی کر کے اس ضلع کے ایک دوسرے گاؤں ناگڑیاں چلے گئے تب سے اب تک یہ خاندان وہیں آباد ہے۔ سید اکمل الدین محمد بخاری کا وصال امرتسر میں ہوا تھا۔

شاہ جی کے دادا نور الدین شاہ بخاری حضرت خواجہ شمس الدین سیالوی علیہ الرحمۃ سے بیعت تھے، کہا جاتا ہے کہ نور الدین شاہ بیعت کے لئے سیال شریف پہنچے تو خواجہ صاحب تعظیماً کھڑے ہو گئے، کچھ دنوں مہمان رکھا پھر پروانہ خلافت اور سند ارشاد دے کر رخصت کیا۔

اتفاقات حسنہ ملاحظہ ہوں کہ شاہ جی کے دادا سیال شریف سے بیعت تھے اور حضرت سید مہر علی شاہ صاحب گولڑہ شریف بھی وہیں سے بیعت تھے۔ شاہ جی نے اولاً سید مہر علی شاہ سے گولڑہ میں بیعت ارشاد کی تھی۔

شاہ جی کے اعزہ میں سے ایک صاحب سید ہارون شاہ کا بیان ہے کہ ہمارے بزرگ بخارا سے کشمیر پہنچے، وہاں برسوں قیام کیا پھر پنجاب چلے گئے، پنجاب سے کاروبار کیلئے دہلی اور پٹنہ کا رخ کیا اور وہاں آباد ہوتے گئے۔

سید نور الدین شاہ کے ہزاروں مرید تھے وہ کسی مرید سے پھوٹی کوڑی نہ لیتے، خود کماتے اور کھاتے، انگریزوں نے پنجاب پر قابض ہونے کے فوراً بعد زرعی نظام کی تنظیم جدید کے لئے زمینوں کی پیمائش کرائی تو ایک اہلکار نے جو آپ کے روحانی کمالات سے متاثر تھا عرض کیا آپ جتنی زمین چاہیں اس پر قبضہ کر لیں، اندراجات میرے سپرد ہیں، آپ کے حسب منشا خانہ پری ہو جائے گی لیکن شاہ صاحب نے انکار کیا اور فرمایا: تمام زمینیں اللہ کی ہیں، ان پر ذاتی ملکیت کی مہریں لگوانا شرعاً ناجائز ہے۔ اُن کے مرہالی چھوڑ کر ناگڑیاں میں آباد ہونے کا باعث بھی یہی تھا کہ اس وقت بہت سے لوگوں نے اس طرح جھوٹ موٹ سے زمینیں حاصل کی تھیں۔

## شاہ جی کا ننھیال

شاہ جی کی والدہ سیدہ فاطمہ اندرابی حکیم سید احمد اندرابی کی صاحبزادی تھیں۔ حکیم صاحب طبیہ کالج لکھنؤ کے فارغ التحصیل تھے اور مروجہ علوم میں دست گاہ رکھتے تھے۔ علم دین سے گہرا لگاؤ تھا۔ آواز میں قدرت نے جادو بھر دیا تھا، شاہ جی ان کی آواز کے سحر کا ذکر بڑے مزے سے کرتے اور فرماتے کہ میرے گلے کی دلفریبی نانا ہی کا صدقہ ہے۔ سید ابوذر بخاری کا بیان ہے کہ اندرابی خاندان سے خاندانی تعلقات کشمیر ہی سے چلے آ رہے تھے۔ شاہ جی کے والد سید ضیاء الدین ابھی نابالغ ہی تھے کہ اپنے تایا سید پیر شاہ بخاری اور اپنے چچا سید حمید شاہ بخاری (والد سید مقیم شاہ بخاری)، کے ہمراہ پشمینہ کی فروخت کے لئے پٹنہ جاتے تو ان حکیم صاحب کے ہاں ٹھہرتے، حکیم صاحب نے ایک روز سید ضیاء الدین کو اپنی فرزندی میں لے لیا اور اپنی بیٹی فاطمہ اندرابی سے ان کی شادی کر دی۔ ان دنوں رمضان المبارک کا آخری عشرہ تھا، سید ضیا الدین نے چوک بازار پٹنہ کی مسجد خواجہ عنبر میں اپنی کمسنی کے باوجود ایک ہی رکعت میں ۲۶ پارے ختم کئے اور مقتدیوں کو حیرت میں ڈال دیا۔

مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی کے دادا مولانا محمد رحمت اللہ کی یادداشتوں میں

شاہ جی نے بھی تبلیغ کی ساری عمر پنجاب میں گذار دی۔ حضرت علامہ انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ اور پانچ سو علماء نے انجمن خدام الدین کے سالانہ جلسہ منعقدہ لاہور میں آپ سے بیعت کی اور اسی جلسہ میں آپ کو امیر شریعت منتخب کیا گیا۔

حضرت خواجہ نے اپنے ملفوظات میں حضرت مجدد الف ثانی کو لکھا ہے۔

"اگر سخن (وعظ) کا اتفاق ہو تو بطور علما کے کہنا بطور صوفیا کے نہیں"

شاہ جی کی ساری زندگی اس کا آئینہ رہی، وہ علم و تصوف کا سیاسی مرقع تھے، ان میں حضور سے غیب، عین سے علم، اور شہود سے استدلال کی رنگا رنگی سمٹی ہوئی تھی۔ لیکن ان میں سلوک و طریقت کے وہ طریق بالکل نہ تھے جن سے مشیخت کو آب و دانہ ملتا ہے۔

خواجہ (نور اللہ مرقدہ) کا مقولہ ہے کہ حاصل سلوک تہذیب الاخلاق ہے، شاہ جی عملاً اس قول کا عکس تھے۔ فرق یہ تھا کہ زمانہ سابق میں مشائخ و علما کے حدود و ذائقہ اب سے مختلف تھے۔ کبھی اصلاح احوال مقصود تھا۔ شاہ جی کے زمانے میں انقلاب احوال مقصود رہا۔

غرض ہر دور میں اس خاندان کا کوئی نہ کوئی فرد فقر و استغنا میں ممتاز تھا اور حسب توفیق فکر و نظر کی لادینی کے خلاف جہاد کرتا رہا۔

## ولادت

شاہ جی یکم ربیع الاول ۱۳۱۰ ہجری (۱۸۹۱ عیسوی) کی چاندرات کو پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ چار برس کے تھے کہ والدہ کا سایۂ عاطفت سر سے اٹھ گیا۔ شاہ جی کی بیٹی ام کفیل نے اس کتاب کی اشاعت اوّل کے بعض مندرجات پر مولف کی بیوی کو ایک خط میں لکھا ہے کہ

" دادا مرحوم (شاہ جی کے والد) نے بیٹے کو ۹ برس کی عمر تک خود ہی پالا پوسا اور خواجہ عنبر کی مسجد میں اپنے ساتھ سلاتے رہے پھر جب اباجی کی عمر نو اور دس برس کے درمیان ہوئی تو دادا جی نے پنجاب آ کر دوسرا عقد کیا۔ ہماری یہ دادی رشتہ میں پردادا کی بھتیجی تھیں۔ تھوڑا عرصہ بعد دادا واپس پٹنہ گئے وہاں ہماری ان دادی صاحبہ کے بطن سے ایک چچا

اور ایک پھوپھی پیدا ہوئے، چچا بفضل تعالیٰ حیات ہیں اور گجرات میں بزازی کی دکان کرتے ہیں۔ پھوپھی اللہ کو پیاری ہو چکی ہیں۔ چچا کا نام سید عطاء الرحمٰن بخاری ہے۔

اباجی کی عمر سترہ یا اٹھارہ برس کی تھی کہ دادا جان کے ہمراہ ۱۳۱۲ھ میں پنجاب آ گئے۔ دادا جان نے تو اپنے آبائی گاؤں ناگڑیاں (ضلع گجرات) میں مستقل سکونت اختیار کر لی اور وہیں ۱۹۲۹ء میں واصل بحق ہوئے لیکن اباجان نے ۱۹۱۴ء سے امرتسر میں قیام کیا اور وہیں کے ہو گئے۔ پاکستان بن رہا تھا کہ امرتسر سے اٹھ کر لاہور آ گئے اور دو چار ماہ لاہور میں قیام کیا پھر نوابزادہ نصر اللہ خان کے گاؤں خان گڑھ چلے گئے وہاں چند مہینے قیام کیا پھر ملتان میں آ کر آباد ہو گئے اور وہاں ۹ ربیع الاول ۱۳۸۱ھ (۲۱ اگست ۱۹۶۱ء) کو چھ بجے شام واصل بحق ہو گئے۔

کل من علیہا فان۔

## تعلیم و تربیت

شاہ جی کسی بھی روایتی مدرسہ کے فارغ التحصیل نہ تھے، وہ ان لوگوں میں سے تھے جو مادر زاد عبقری ہوتے اور جن کی تربیت، مبدا فیاض کرتا ہے اس ضمن میں چند باتیں واضح ہیں۔ مثلاً

(۱) شاہ جی کے ننھیال اور ددھیال میں پنجاب اور بہار کا جغرافیائی فاصلہ تھا۔

(۲) وہ اپنے ننھیال کی اکلوتی بیٹی کے فرزند تھے، ان کی والدہ رحلت کر گئیں تو ان کی عمر چار سال تھی۔ نانی اماں نے آغوش میں لے لیا۔ ان حالات میں وہ بہمہ وجوہ مدرسہ کی تعلیم سے محروم ہو گئے۔

(۳) ایک تو حالات حسب حال نہ تھے دوسرے والدہ کی وفات سے پیش آمدہ حالات کے نتیجہ میں مدرسہ کی تعلیم کا ہاتھ آنا مشکل ہو گیا تھا۔

(۴) انگریزی مدرسوں میں ان کے داخلہ کا سوال ہی نہ تھا کیونکہ جس خاندان سے متعلق تھے وہاں انگریزی مدرسوں میں داخلہ خارج از بحث تھا۔

## سیاست میں شرکت

شاہ جی امرتسر میں علوم دینیہ کی تعلیم حاصل کر رہے تھے کہ پہلی جنگِ عظیم خلافت عثمانیہ کو تاراج کر کے ختم ہو گئی۔ ہندوستان کو جو صلہ ملا وہ سب کے سامنے تھا۔ رولٹ ایکٹ نے سارے ملک کو برہم کر دیا، پنجاب کو جو اس جنگ میں برطانوی سلطنت کا بازوئے شمشیر زن تھا یہ انعام ملا کہ کئی اضلاع میں مارشل لا۔ یا اس سے مشابہ قانون نافذ کیے گئے۔ گرفتاریوں کا زور بندھ گیا۔ امرتسر میں جلیانوالہ باغ کا حادثہ پیش آیا جس سے ملک کی تاریخ پلٹا کھا گئی اور سیاسی لیڈرشپ پہلے ہاتھوں سے نکل کے نئے ہاتھوں میں آگئی، یہی وہ آغاز تھا کہ تلک اور گھوکھلے پیچھے ہٹ گئے مسٹر جینا ابھی نوجوان تھے اور گاندھی جی کی طرح گھوکھلے کے سیاسی شاگرد تھے لیکن وہ بھی مسلمانوں کی سرکاری لیڈرشپ کے مانند گوشہ نشین ہو گئے۔ یہ زمانہ مہاتما گاندھی، مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت موتی لال نہرو اور علی برادران کا سرآغاز تھا اور ملک اس نئی لیڈرشپ کے ہاتھ میں جا رہا تھا۔

جلیانوالہ باغ کے مظالم سے ملک بھر میں آگ لگ گئی۔ امرتسر میں ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال کی گرفتاری نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ یہ ہندوستان کے سفرِ آزادی کا پہلا موڑ تھا۔ اس زمانہ کے بعض انگریز افسروں نے اعتراف کیا ہے کہ جلیانوالہ باغ میں جنرل ڈائر کی آتش بازی ہندوستان سے انگریزی حکومت کی رخصتی کا سرآغاز تھا۔ پاکستان کے مشہور مصنف ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی کا بیان ہے کہ ۱۹۶۸ء میں وہ ڈھونڈ ڈھانڈ کے انگلستان کے ایک گاؤں میں امرتسر کے اُس ڈپٹی کمشنر سے ملنے گئے جس نے جلیانوالہ باغ میں فائرنگ کا حکم دیا تھا۔ اس بوڑھے انسان نے ان دنوں کا تذکرہ کرتے ہوئے اقرار کیا کہ ہم نے امرتسر پر قابو ضرور پا لیا تھا لیکن وہ دن برطانوی حکومت کے انحلال کا پہلا دن تھا۔

شاہ جی ان دنوں مدرسہ نعمانیہ مسجد خیر الدین میں مشکوٰۃ شریف پڑھ رہے تھے لیکن طالب علمی ادھوری تھی، ایک چھوٹی سی مسجد (کوچہ جیل خانہ) میں امام ہو گئے چونکہ خوش الحان

وخوش بیان تھے لہذا امرتسر کے مسلمانوں میں واعظ کرنے لگے ، ان دنوں بدعات کا زور تھا ، اصلاح رسوم کی بنیو اُٹھائی اور تمام شہر میں ایک خوش بیان و فصیح اللسان کی حیثیت سے مشہور ہو گئے ۔ مولانا داؤد غزنوی علیہ الرحمۃ نے ایک مقالہ میں لکھا ہے کہ :

"میں نے امرتسر میں خلافت کمیٹی (۱۹۱۹ء) کی بنیاد رکھی اور لوگوں کو انگریزوں کے مظالم سے آگاہ کرنا شروع کیا تو بعض لوگوں نے میرے خلاف شاہ جی کو کھڑا کیا۔ میں نے اندازہ کیا کہ شاہ جی کو ملکی حالات اور قومی سیاست کا مطلقاً علم نہیں ۔ وہ استعمال کیے گئے ہیں ، میں نے شاہ جی کو اپنے ہاں بلا بھیجا ، ان سے بات چیت کی معلوم ہوا وہ نہ تو اخبارات پڑھتے ہیں نہ سیاست سے آشنا ہیں اور نہ انہیں یہ معلوم ہے کہ خلافت وغیرہ کا مسئلہ کیا ہے ؟ آخر میری تحریک پر راضی ہو گئے کہ وہ میرے ساتھ رہ کر چند دنوں میں ان مسائل سے آگاہ ہو جائیں گے چنانچہ ایک مختصر سی مدت ہی میں وہ سب کچھ جان گئے پھر دنیا جانتی ہے کہ اس عظیم الشان خطیب نے سارے ملک میں آگ لگا دی"۔

شاہ جی فرماتے تھے مولانا ابوالکلام آزاد کے الہلال نے ان کی کایا پلٹ دی اور مولانا ظفر علی خاں کے زمیندار و ستارہ صبح نے انہیں حریت پسندوں کے قافلہ میں شامل کر دیا۔ یہاں لاہور کے ایک جلسہ عام میں مولانا ظفر علی خاں کے کانوں کو تھپتھپاتے ہوئے کہا تھا :

"ظفر علی خان ترے ستارۂ صبح نے میرے جگر میں آگ لگا دی تھی"۔

یہ واقعہ ہے کہ ۱۹۱۹ء سے ۱۹۳۲ء تک پنجاب کی سیاسی آبیاری اور ہندوستان کے قومی ذہن کی نشوونما میں جن راہنماؤں کا نام سرفہرست ہے ان سربرآوردہ راہنماؤں کی جماعت میں شاہ جی کی جادو بیانی کا بہت بڑا حصہ تھا۔ وہ اس وقت مہاتما گاندھی ، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی جوہر وغیرہ کی صف کے سیاسی راہنما نہ تھے۔ لیکن تحریک خلافت یا تحریک عدم تعاون کا تذکرہ ان کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ شاہ جی نے اس قومی جدوجہد کو بال و پر مہیا کیے اور دیکھتے دیکھتے ہندوستان کے ان نامور خطبا کی صف میں شامل ہو گئے جن کی

رجز خوانیوں سے یہ کارواں منزلِ مقصود کی طرف چلا جا رہا تھا۔

مہاتما گاندھی نے قومی سیاست میں داخل ہوتے ہی ۶ اپریل ۱۹۱۹ء کو رولٹ ایکٹ کے خلاف ہمہ گیر ہڑتال کا اعلان کیا تو ایک نیا ہندوستان پیدا ہو گیا۔ یہی وہ دن تھے جب ہندو مسلم اتحاد ایک معجزہ تھا۔ اور انگریز اس سے سخت ہراساں تھے۔ انہی دنوں امرتسر میں ریلوے کے بڑے پل سے ایک احتجاجی جلوس گزر رہا تھا کہ گورہ سپاہیوں نے گولی چلا دی جس سے چھ ہندوستانی جاں بحق ہو گئے، شاہ جی نے خیر الدین کی مسجد میں مسلمان شہدا کا جنازہ پڑھایا۔ ۱۰ اپریل کو ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال گرفتار کیے گئے تو سارا شہر آگ بگولا ہو گیا۔ ۱۳ اپریل کو جو یکم بیساکھ تھا امرتسر کے لوگ اپنے رہنماؤں کی گرفتاری کے خلاف احتجاج کرنے جلیانوالہ باغ میں اکھٹے ہوئے لیکن جنرل ڈائر کی بے تحاشا گولیوں کا نشانہ بن گئے اس مقتل میں پانسو ہندوستانی شہید ہوئے۔ زخمیوں کی تعداد کا اندازہ لگانا مشکل ہو گیا۔ دسمبر ۱۹۱۹ء میں انڈین نیشنل کانگریس کا سالانہ اجلاس بصدارت موتی لال نہرو امرتسر میں منعقد ہوا۔ مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس بھی حکیم اجمل خان کے زیرِ صدارت یہیں ہوا اور خلافت کانفرنس بھی مولانا شوکت علی کے زیرِ صدارت گول باغ امرتسر میں منعقد ہوئی ——— شاہ جی نے اس کانفرنس میں معرکہ آرا سیاسی تقریر کی یہ اُن کے جماعتی سفر کا آغاز تھا۔ اجلاس میں تحریک خلافت کے لیے دس لاکھ روپے اکھٹے ہو گئے، شاہ جی امرتسر سے باہر پہلی دفعہ کلکتہ کانگرس (فروری ۱۹۲۱ء) کے سالانہ اجلاس میں شامل ہوئے اور وہاں مولانا ابو الکلام آزاد کی تجویز ترکِ موالات کی تائید میں ایک پُرشکوہ تقریر کی اس سے ان کی دھاک بیٹھ گئی اور وہ صفِ اوّل کے ہندوستانی راہنماؤں میں شمار ہونے لگے۔

لاہور میں پہلی خلافت کمیٹی قائم کی گئی تو علامہ اقبالؒ اس کے صدر اور سر محمد شفیع سیکرٹری مقرر ہوئے لیکن سر مائیکل اڈوائر کے غضب کی تاب نہ لا کر ڈپٹی کمشنر لاہور کے اشارے پر مستعفی ہو گئے بلکہ خلافت کمیٹی ہی کو ختم کر دیا۔ حکیم عبد المجید عتیقی مولانا ثناء اللہ کے ہاں

امرتسر پہنچے اور اُن سے یہ ماجرا بیان کیا۔ مولانا ثناء اللہ نے ان کے ساتھ شاہ جی کو لاہور بھجوا دیا، جلسہ عام کا اعلان ہوا تو خوف کا یہ عالم تھا کہ موچی دروازہ کے باغ میں تین چار سو آدمی جمع نہ ہو سکے لیکن شاہ جی کی قرآن خوانی اور خوش بیانی رنگ لائی، اگلے روز جلسہ میں ۲۰ ہزار آدمی شریک ہوئے اور شاہ جی صبح تین بجے تک بولتے رہے۔ تمام شرکاء مسحور ہو گئے۔ شاہ جی نے ڈنکے کی چوٹ اعلان کیا کہ لاہور میں خلافت کمیٹی ضرور بنے گی کسی حاطب اللیل میں ہمت ہے تو وہ اس کمیٹی کو توڑ کر دکھائے۔ چنانچہ شاہ محمد غوث سے متصل میاں سراج الدین پراچہ کے مکان میں خلافت کمیٹی کا دفتر قائم کیا گیا اور وہیں عہدیداروں کا انتخاب ہوا۔ سید حبیب ایڈیٹر روزنامہ سیاست کمیٹی کے صدر اور میاں فیروز الدین احمد سیکرٹری منتخب کئے گئے۔

## سیاسی مسلک

یہ کہنا مشکل ہے کہ شاہ جی دیوبند کے مدرسہ فکر سے ذہناً کب وابستہ ہوئے اور شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ سے ان کی نظری وابستگی کا سن آغاز کیا تھا لیکن دیوبندی نہ ہونے کے باوجود ان کا دیوبند کے اکابر و افکار سے رشتہ اس قدر گہرا ہو گیا کہ ان کے مبلغ بھی تھے اور مجاہد بھی۔ عمر بھر انہوں نے اس مدرسہ فکر کا ساتھ دیا، کسی عنوان سے جب کوئی معرکہ دیوبند کے دفاع یا دعوت کا پیش آیا شاہ جی ہمیشہ اس کے ہراول میں رہے۔

شاہ جی نے بدعات سے جنگ کی تو دیوبند کی تعلیمات کو ملحوظ رکھا۔ سلطان ابن سعود کا ساتھ دیا تو دیوبند ہی کا مطمح نظر سامنے رکھا۔ انگریزوں سے ان کے جہاد و غزا کا منبع بھی دیوبند ہی کے اکابر کا فکر و عمل تھا۔ وہ انگریزوں کے اس لئے مخالف نہیں تھے کہ ان کے پیش نظر محض نظریاتی مہم کا اصلی اصول تھا ان کی انگریزوں کے خلاف جدوجہد کا سبب یہ بھی تھا کہ برعظیم کے علماء نے نصاریٰ کی ہر نوعی غلامی کو حرام قرار دیا اور ہندوستان ان کے نزدیک "دارالحرب" ہو گیا تھا، برطانیہ کو وہ اسلام کا دشمن سمجھتے اور اس کے خلاف جہاد و جنگ فی الجملہ ان کا نصب العین تھا۔

وہ دراصل شاہ ولی اللہؒ اور ان کے خاندان سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ

کی جدوجہد کے سیاسی وارثان رہے تھے۔ ان کی تمام جدوجہد کا ماحصل یہ تھا کہ جو کچھ ان اکابر کے منہ سے نکلا اس کی آبیاری و ثمر آوری اپنا دینی فرض سمجھا۔ انہیں ہندوستان کے سیاسی مباحث یا قومی مسائل سے کوئی تعلق نہ تھا وہ صرف اکابر علماء کی سیاسی روایتوں اور دینی حکایتوں کے معنوی وارث تھے اور ان کے مطابق اپنی جدوجہد کا سفر کرتے رہے۔ ان کے سامنے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا یہ فتویٰ (۱۷۶۵ء) تھا کہ:

"انگریزی حکومت سے جہاد فرض ہو چکا ہے اس کی توفیق نہ ہو تو ہر دیندار مسلمان پر ہجرت لازم ہو گئی ہے" (بہ تلخیص)

مولانا عبدالباری فرنگی محل لکھنؤ نے اپریل ۱۹۱۵ء کو اس فتویٰ ہی کی اساس پر فتویٰ دیا تھا کہ:

"ہندوستان دارالحرب ہو چکا ہے مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ ہندوستان سے ہجرت کر کے کسی ایسے ملک میں چلے جائیں جہاں کی قدریں اسلام سے ملحق ہوں"

اسی کا نتیجہ ہندوستانی مسلمانوں بالخصوص پنجاب و سرحد کے مسلمانوں کی ہجرت تھی۔ آل انڈیا خلافت کانفرنس دہلی کے اجلاس میں علامہ عزیز ہندی نے اس مضمون کی قرارداد پیش کی تو فوراً پاس ہو گئی، لوگوں نے ہجرت شروع کی اور لوگ قافلہ در قافلہ کابل جانے لگے حکومت نے ابتداً روکنا چاہا لیکن مانتا کون؟ آناً فاناً کوئی چالیس ہزار افراد افغانستان پہنچ گئے۔ غازی امان اللہ نے انہیں زمینیں دیں، ملازمتیں دیں اور تجارت میں حصہ دار کیا لیکن جو لوگ سرکاری جاسوس کی حیثیت سے ان کے ساتھ گئے تھے وہ گل کھلانے میں کامیاب ہو گئے انہوں نے امان اللہ خان کو بھی زچ کیا تاہم ایک نتیجہ ضرور نکلا کہ افغانستان انگریزی حکومت کے انتداب سے آزاد ہو گیا۔ ہجرت کرنے والوں میں مولانا احمد علی لاہوری، خان عبدالغفار خان اور جناب اقبال شیدائی بھی شامل تھے۔

مولانا محمد علی جوہر اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری وغیرہ ان دنوں لندن میں وفد خلافت

لے کر گئے ہوئے تھے، یہاں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا شوکت علی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور مولانا حسین احمد مدنی وغیرہ اس ہجرت کو مضر خیال کرتے اور ہندوستان ہی میں غیر ملکی غلامی کے خلاف نبرد آزمائی کے حق میں تھے۔ مولانا حسین احمد مدنی نے ۱۱ر جولائی ۱۹۲۰ء کو خلافت کانفرنس کراچی کے اجلاس میں حکومت برطانیہ کی ہر نوعی ملازمت کو شرعاً حرام قرار دیا تو اس قرارداد اور مختلف زعماء کی تقریروں سے برافروختہ ہو کر حکومت نے ملک بھر میں گرفتاریوں کا آغاز کیا۔ مولانا محمد علی، مولانا حسین احمد مدنی، پیر غلام مجدد وغیرہم کراچی میں ۱۲۴ الف کے تحت دھر لیے گئے، انہیں دو دو اور تین تین برس کی سزا دی گئی۔

آخر کار منفی و مثبت اثرات کے تحت ہجرت کی تحریک ختم ہو گئی، کچھ لوگوں کے سوا تقریباً سبھی لوگ واپس آ گئے، اُن مسلمانوں کو سخت نقصان اُٹھانا پڑا جو اپنی جائدادیں اونے پونے فروخت کر کے کابل گئے تھے، لاہور سے دو مولوی عبدالحق اور عبدالرحمٰن بھی سرکاری جاسوس کی حیثیت سے مہاجروں کے ساتھ گئے تھے لیکن ان کا انجام یہ ہوا کہ دونو حکومت کے ہاتھوں مارے گئے۔

شاہ جی تحریک ہجرت کے معاون تھے اور انہی کی تقریروں سے متاثر ہو کر بے شمار لوگ امرتسر سے کابل گئے تھے۔

اُدھر حضرت شیخ الہند محمود حسن (علیہ الرحمۃ) اپنے شاگرد رشید مولانا حسین احمد مدنی کے ساتھ مالٹا سے رہا ہو کر ہندوستان پہنچے تو جمعیۃ العلماء نے شیخ الہند کو اپنا صدر منتخب کر لیا۔ اس زمانہ ہی میں شیخ الہند کے ہاتھوں جامعہ ملیہ دہلی کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ مولانا محمد علی جوہر جامعہ کے بانی تھے اور انہی کی تحریک پر جامعہ قائم ہوا تھا۔ اِدھر شاہ جی نے انہی دنوں گجرات میں آزاد ہائی سکول قائم کیا۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ نے افتتاح کیا۔ چودھری فیض محمد ایم، اے ہیڈ ماسٹر اور ملک نصر اللہ خان عزیز سیکنڈ ماسٹر مقرر کیے گئے۔ آجکل وہ اسلامیہ ہائی سکول کے نام سے منسوب ہے۔ آخر کار حکومت نے ۲۷ مارچ ۱۹۲۱ء کو آدھی رات کے وقت

زیر دفعہ ۱۲۴ الف شاہ جی کو پکڑ لیا۔ کچھ دنوں مقدمہ چلا پھر ۸ ۔ اپریل کو مسٹر ایف اے کارنر ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے تین سال قید بامشقت کی سزا سنا دی، اس میں تین ماہ قید تنہائی کے تھے ——— اس قید نے شاہ جی کو انگریزی حکومت کا مستقل باغی بنا دیا اور وہ ۱۳ اگست ۱۹۴۷ء کی رات کے بارہ بجے تک برطانوی استعمار کے خلاف جدوجہد کرتے رہے، ان ۲۶ سال میں انہوں نے آٹھ سے دس ہزار کے درمیان تقریریں کی ہوں گی جن کا لب ولباب اور مطلع و مقطع انگریزی حکومت کی بیخکنی تھا۔

شاہ جی نے اس سارے عرصہ میں بہت سے معرکے سر کئے اور کئی دفعہ جیل گئے مثلاً تحریک خلافت، تحریک شدھی، تحریک قبہ، تحریک حفظ ناموس رسالتؐ، تحریک مرزائیت تحریک عدم تعاون، تحریک کشمیر، تحریک شہید گنج، تحریک آزادئ وطن اور دوسری جنگ عظیم میں فوجی بھرتی کی مزاحمت! فی الجملہ قومی جدوجہد، سیاسی رزم و بزم اور دینی جہاد و جنگ کے مختلف العنوان سلسلے تھے جن میں شاہ جی نے بھرپور حصہ لیا۔ وہ محض حصہ دار ہی نہیں تھے بلکہ ان کا پورا کردار ایک ایسے حدی خوان کا تھا جس کی آواز سے قافلہ مرتب ہوتا اور منزل کی طرف قدم اٹھاتا ہے۔ یہ ذکر کسی دوسرے باب میں آئے گا کہ اس سفر میں وہ کن کن صعوبتوں سے گزرے اور اپنی عمر عزیز کا کتنا حصہ قید و بند کے آغوش میں بسر کیا حتیٰ کہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔

## عقیدہ و مسلک

شاہ جی حنفی مسلک کے تھے لیکن ان حدود کے باوجود قلندر قسم کے مسلمان تھے کہ ہر مسلک و مشرب سے ایک گونہ مناسبت تھی، کسی مسلک سے تعرض ہوتا تو اس کے پس منظر میں صرف یہ چیز ہوتی کہ اس کی بنیاد میں انگریز دوستی تو نہیں ہے یا پھر وہ ان مظاہر و آثار کے مخالف تھے جن سے شرک فی التوحید یا شرک فی النبوۃ کو راستہ ملتا تھا اور لوگ اصل دین کو چھوڑ کر نقلی دین کا کھڑاگ رچاتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ از روئے اسلام وہ ہر اُس مسلک و مشرب کے ساتھ تھے جس سے انگریزوں کی غلامی ختم ہوتی اور ان کے خلاف ذہنی آب و ہوا کو نشو و بلوغ حاصل ہوتا اور ہر اس مسلک و مشرب سے کنی کتراتے بلکہ اس کے پیرووں پر بشرطِ ضرورت تابڑتوڑ حملے کرتے جس مسلک و مشرب کو مداہنت و مصلحت سے داغدار پاتے۔

انہوں نے شہادتِ حسینؓ پر بہت کم تقریریں کیں، ایک دفعہ راقم نے عرض کیا کہ شاہ جی سانحہ کربلا پر تقریر فرمایئے، کہنے لگے میں اس موضوع پر تقریر نہیں کر سکتا میرے خاندان پر جو بیتی ہے بیان کروں تو خود میرا جگر شق ہو جائے گا لیکن عام تقریروں میں جب کبھی اس حادثہ محزنہ کا ذکر کرتے تو ایک آدھ روایت ہی سے لوگوں کی چیخیں نکل جاتیں کہ بڑے بڑے ذاکر و مجتہد ان کے سامنے رہ جاتے تھے۔ ان کا مسلک سینہ کوبی یا سوز خوانی نہیں تھا۔ جب کبھی کسی سیاسی مسئلہ میں شیعہ اکابر کو جھنجھوڑتے تو فرماتے:

"کیا ہو گیا ہے تمہیں، حسین علیہ السلام کا نام لیتے ہو لیکن صدیوں سے تمہارا اشعار یہ ہو گیا ہے کہ یزید مُردہ پر لعن کرتے ہو اور یزید زندہ کی پوجا کرتے ہو۔"

بدعات کے خلاف طعن و تعریض کرتے اور مسلمانوں کو ان سے روکتے تو دو کاندار علماء ان پر وہابی کا طعن توڑتے لیکن ان کے لئے یہ طعن بیکار تھا۔ جن دنوں ابنِ سعود نے قبہ شکنی کی اور سرکاری علماء نے ہندوستان میں ابنِ سعود کے خلاف ہنگامہ برپا کیا تو شاہ جی ابنِ سعود کے طرفدار تھے اس جرم میں انہیں وہابی کہا گیا حالانکہ وہابی نہ تھے اور نہ کبھی جماعتِ اہلِ حدیث نے اپنی کسی تحریر و تاریخ میں انہیں اپنا تسلیم کیا لیکن ہندوستان کے اہلِ حدیث علماء کی سزا اکثر انہیں ملی، جگہ جگہ شاہ جی کے وہابی ہونے کا چرچا ہو گیا۔ ان دنوں کسی بدو نے سلطان عبد العزیز ابن سعود کو بیت اللہ میں خنجر مار کر ہلاک کرنا چاہا، محافظ دستہ آڑے آگیا اور سلطان محفوظ ہو گئے لیکن حملہ آور محافظ کی گولی سے وہیں ڈھیر ہو گیا۔ شاہ جی ابن سعود ہی کے مسئلہ پہ تقریر کر رہے تھے سوال کیا گیا،

تصوف، وجدان کی تنقیح کرتا ہے اور علم سے وسعت فکر پیدا ہوتی ہے۔ اس ضمن میں امام مالک کے نقطہ نگاہ سے موافق تھے کہ جو شخص صوفی ہوا اور فقیہ نہ ہوا وہ گمراہ ہوا، اور جو فقیہ ہوا اور صوفی نہ ہوا وہ فاسق رہا جس نے ان دونوں کو جمع کیا وہ محقق ہو گیا۔ وہ ہندوستان کے صوفیوں کی بہت سی ٹکڑیوں سے بیزار تھے ان کا خیال ہی نہیں تجربہ تھا کہ ہندوستان کا تصوف ہندو مائی تھالوجی (خرافیات) کی اسلامی شکل ہے اس کو حجازی اسلام سے کوئی واسطہ نہیں، جس تصوف سے سکنت پیدا ہو یا توجہ الی اللہ مخلوق خدا سے کنارہ کشی سکھائے وہ اس مسلک سے بیزار تھے ان کے نزدیک یہ ہندوازم کا جوگ تھا۔

فرمایا ایک دفعہ میں نے بھی خانقاہی ہونا چاہا، ۲۱ سال تک روزے رکھے چھ چھ گھنٹے میں قرآن پاک ختم کیا، کئی کئی روز پانی میں نمک ملا کر جو کے ستوؤں پر گزر کی، تنور کی روٹی کے خستہ ٹکڑے کھاتا رہا لیکن اس سے بس اتنی معرفت قلب پیدا ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ میں قناعت پیدا کر دی اور میں سیر چشم ہو گیا اس ریاضت ہی کا نتیجہ میری خطابت کا بانکپن تھا۔

قبہ شکنی کا ذکر ہو رہا تھا فرمانے لگے میں نے ابن سعود کی حمایت صرف اس لئے کی تھی کہ جو لوگ یہاں ان کی مخالفت میں پیش پیش ہیں وہ ہندوستان میں انگریزی حکومت کے مہرے تھے اور ابن سعود کا وجود برطانوی حکومت کے لئے اس لحاظ سے سوہان روح تھا کہ اس نے انگریزی استعمار کے ایک ذلیل مہرے شریف مکہ کو اکھاڑ پھینکا تھا۔ شاہ جی کا ارشاد تھا کہ ہندوستان میں وہی لوگ ابن سعود کے خلاف واویلا کر رہے تھے جو پہلی جنگِ عظیم میں انگریزوں کے خدمتگار اور سپاس گزار تھے۔ (الا ماشاء اللہ) ان کے نزدیک ابن سعود کے خلاف ہندوستان کے مسلمانوں کا ہنگامہ انگریزوں کی شاطری تھا۔ انگریزوں کو اندازہ ہو چکا تھا کہ تحریکِ خلافت ان کے لئے کیا داغ چھوڑ گئی ہے اور مسلمانوں کی دنیائے اسلام سے وابستگی کے نتائج کیا ہو سکتے ہیں؟ مسلمانوں کو شریف مکہ سے جو نفرت پیدا ہوئی تھی انگریز اپنے اس مہرے کی شکست کے بعد اس نفرت کو ابن سعود کی طرف منتقل کرنا چاہتے تھے تاکہ حجاز میں انگریزوں کی آئندہ

سیاست ہندوستانی مسلمانوں کے لئے کسی نئی تحریک کا باعث نہ ہو۔

شاہ جی نے اس مہم میں ضعیف الخیال مسلمانوں سے بہت سی گالیاں سُنیں لیکن اپنا مشن جاری رکھا۔ اور کفر کے فتووں کو خندۂ زیر لب کی نذر کرتے رہے، جیسے کوئی چیز ہی نہیں۔

شاہ جی اصلح من الناس کے قائل تھے، حضرت سید پیر مہر علی شاہ گولڑہ شریف سے بیعت ارشاد کی، حضرت شیخ عبدالقادر رائے پوری سے بیعت جہاد، وہ خواجہ معین الدین چشتی، حضرت نظام الدین اولیاء اور حضرت بابا فرید الدین گنج شکر کے والہ و شیدا تھے۔ حضرت مجدد الف ثانی کے شیدائی اور شاہ ولی اللہ کے فدائی تھے۔ حقیقۃً وہ ایک سیدھے سادے راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ ان کے ہاں مذہب کی رعونت اور دین کا آزار بالکل نہ تھا، غرض فقر و سیاست کا ایک ایسا چشمہ تھے جس سے کئی سوتے پھوٹتے تھے۔ وہ اہل اللہ کے سوا کسی سے مرعوب نہ ہوتے، قدرت سے بے نیاز طبیعت لے کر پیدا ہوئے تھے اور آخری سانس تک اس پر قائم رہے کوئی شخص اپنے اقتدار و وجاہت کے بل پر ان سے کوئی مطالبہ نہ کر سکتا تھا۔

ان کی محفل آرائیاں سیکڑوں مرتب و غیر مرتب کتابوں کا خلاصہ ہوتیں، ان کے ہاں کسی کیلئے کوئی روک نہ تھی وہ انگریزی استعمار اور میرزا غلام احمد کی نبوت کے سوا کسی کے دشمن نہ تھے ان کا دروازہ ہر شخص کے لئے کھلا تھا۔ جہاں ایک جام بدست رند سے لے کر ایک عمامہ بر سر زاہد تک اور ایک کفن بدوش مجاہد سے لے کر ایک شاہد بکنار شاعر تک بلا تکلف داخل ہو سکتے تھے وہ تنہائی سے نفرت کرتے اور آشنائی سے محبت رکھتے تھے، انہیں معلوم تھا کہ تنہائی کے آگے بازار ہے اور بازار پریشانی کا نام ہے لیکن وہ کانٹوں میں کھلنے والے انسان تھے، انہیں تخلیہ سے زیادہ مجمع اور کتابوں سے زیادہ انسانوں کا غول پسند تھا، فرماتے ان کتابوں کو پڑھ کر کیا لوں گا؟ جن سے عقل ویران ہوتی اور عشق کو مصلحت کی دیمک لگ جاتی ہے، اپنے احباب میں اکثر و بیشتر ذیل کا شعر بہ لحن پڑھا کرتے ؎

غلام مصطفےٰ تبسم کا میدان فکر و نظر مختلف تھا لیکن ان سے سالہا سال کی دوستی تھی۔ ایک دفعہ جن کو پرکھ لیا، پرکھ لیا۔ پسند و ناپسند دونوں میں سخت تھے، ہر شخص سے متعلق نپی تلی رائے ہوتی، ہندوستان میں کوئی سیاسی یا شرعی راہنما ایسا نہ تھا جن سے ان کے مراسم نہ رہے ہوں لیکن ہر ایک کے بارے میں دو ٹوک رائے رکھتے اگر کسی کے خلاف رائے قائم ہوگئی تو اس میں کینہ یا بغض نام کو نہ ہوتا اور نہ کبھی سے ذاتی بنیادوں پر منتقم ہوتے۔ جن رفقا پر اعتماد کیا ان کی غلطیوں پر دامن ڈال دیتے جن دوستوں میں عمر بسر کی انہیں جی جان سے چاہا۔ ان سے کوئی شکایت پیدا ہوئی تو مسکرا کر ٹال گئے۔ بعض بڑی ہستیوں کے متعلق عجیب و غریب رائے تھی، گاندھی جی کو مہاتما کم اور سیاست دان زیادہ سمجھتے تھے۔ پنڈت موتی لال نہرو اور سی آر داس کو سچا نیشنلسٹ مالویہ جی اور ولبھ بھائی پٹیل کو پکا ہندو، مولانا ابوالکلام آزاد کو علم کا سمندر، پنڈت جواہر لال نہرو کو سیاسی طوفان، مولانا حسین احمد مدنی کو متحرک تقویٰ اور مفتی کفایت اللہ مرحوم کو دورِ حاضر کا ابوحنیفہ سمجھتے تھے علامہ اقبال سے تازیست دلی تعلق رہا۔ جب کبھی ان کے ہاں جاتے تو حضرت علامہ تپاک سے ملتے، فرماتے:

"پیر جی فلاں بات ہوگئی ہے۔"

"کونسی بات ؟"

"بس ہوگئی ہے، آپ سے بیان کیا تو آپ دہلی دروازہ کے باغ میں ڈھنڈھی پیٹ دو گے ؛ اچھا سنئے، ایک تازہ نظم ہوئی ہے۔"

علامہ سناتے، شاہ جی سنتے اور جھومتے، چودھری افضل حق مرحوم کو احرار نے مہاتما کا لقب دے رکھا تھا۔

"کہو مہاتما جی، ہمارے لئے کیا پروگرام سوچ رکھا ہے ؟"

مولانا حبیب الرحمٰن کو عنایت ارائیں کہتے اور خود بلھے شاہ بنتے۔ میاں قمر الدین مرحوم احرار کے بر لاتے تھے، انہیں اپنا چلتا پھرتا بنک کہہ کر پکارتے، شیخ حسام الدین سے

کے دنوں آگرہ میں ہوا وہاں قصابوں نے رات بھر شور مچائے رکھا کہ ہم جلسہ نہیں ہونے دیں گے اور فجر کی اذان تک یہی عالم رہا۔ اُدھر قصابوں کے پاس چھریاں اور کلہاڑیاں تھیں ادھر شاہ جی ڈٹے ہوئے تھے، آخر فسادیوں کو جانا پڑا اور شاہ جی نے صبح کی نماز سے ۹ بجے دن تک تقریر کی، اس قسم کی ہنگامہ آرائیاں شاہ جی نے عمر بھر برداشت کیں، بالخصوص نہرو رپورٹ سے لے کر شہید گنج کی تحریک تک اور شہید گنج کی تحریک سے لے کر تحریک پاکستان تک وہ انہی طوفانوں سے گذرتے رہے، اکثر دفعہ قاتلوں سے واسطہ پڑا لیکن قدرت دستگیری کرتی رہی اور وہ ہر معرکہ سے سرخرو نکلے۔ ان پر ایک سخت قسم کا وار بمبئی میں ہوا ایک جانب سے تیزاب میں بجھی ہوئی تیز دھار کی چھری مجمع کے سروں سے نکلتی ہوئی ان کے سینہ میں پیوست ہوا چاہتی تھی کہ کوہاٹ کے ایک ۱۲ سالہ نوجوان نذر خان نے پھرتی سے بڑھ کر سینہ پر اٹھالی، نتیجۃً وہ نوجوان اس کے مہلک وار سے انتقال کر گیا۔

مئی ۱۹۳۳ء میں شاہ جی مدرسہ عربیہ شجاع آباد میں مدعو تھے وہاں تقریر کے لئے کھڑے ہونے تو قاضی احسان احمد سے فرمائش کی، پان نہیں کھلاؤ گے؟ ایک صاحب پاس کھڑے تھے انہوں نے پان پیش کیا اور چلے گئے۔ شاہ جی نے پان کو منہ میں رکھا تو چلا اٹھے "زہر دے دیا ہے"۔

فوراً ھتھوکا، چہرے کا رنگ سیاہ ہو گیا، ڈاکٹر لچھمن داس ریٹائرڈ سول سرجن رات تین بجے تک زہر نکالنے میں کامیاب ہو گئے اور اس طرح موت کا وار ناکام ہو گیا۔

میرزا بشیر الدین محمود خلیفہ قادیان نے بہت سے لوگ ان کے قتل پر مامور کیے لیکن کسی کو کبھی حوصلہ نہ ہوا، آخر میرزا صاحب نے راجندر سنگھ آتش نام کے ایک سکھ نوجوان کو دس ہزار روپے میں خرید کیا۔ پانچ ہزار پیشگی ادا کئے پانچ ہزار بعد از قتل دینے کا وعدہ کیا لیکن راجندر سنگھ آتش نے شاہ جی پر اس راز کا انکشاف کر دیا، دوسری جنگِ عظیم میں راجندر سنگھ آتش منٹگمری سنٹرل جیل میں راقم کے ساتھ قید تھا "پسِ دیوارِ زنداں" میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔

## علالت

پروفیسر کرنل ضیاء اللہ نے شاہ جی کا طبی معائنہ کرتے ہوئے کہا تھا حضرت اللہ تعالیٰ نے آپ کو صدیوں کی عمر دے کر بھیجا تھا لیکن اپنی صحت سے آپ نے انصاف نہیں کیا اور جو کچھ یکایک پیش آگیا ہے اس "مجرمانہ" تغافل ہی کا نتیجہ ہے۔

شاہ جی نے ۱۸-۱۹۱۷ء میں تقریریں شروع کی تھیں لیکن اس وقت امرتسر میں ایک واعظ تھے۔ جونہی جلیانوالہ باغ (۱۹۱۹ء) کا حادثہ ہوا تو سیاسی زندگی میں داخل ہوگئے۔ پھر مرض الموت سے کچھ عرصہ پیشتر تک (۲۱ اگست ۱۹۶۱ء) ریل و جیل اور خطابت و سیاست میں لگے رہے۔ ایام قید، عیدین اور خاص تہواروں کے علاوہ کوئی دن ہوگا کہ آپ نے کسی شہر یا قصبہ میں خطاب نہ کیا ہو۔ عموماً طویل تقریر فرماتے اور جب تک اپنی بات لوگوں کے دل پر نقش نہ کر لیتے تقریر ختم نہ کرتے۔ ان کی بعض تقریریں دس دس گھنٹے بلکہ کئی ایک بیس بیس گھنٹے تک چلی گئیں لیکن کوئی سی تقریر بھی تین چار گھنٹے سے کم نہ ہوتی، ہر جلسہ کے آخر میں تقریر کرتے ان کی نوے فیصد تقریریں دوسرے مقرروں کے بعد رات بارہ بجے شروع ہوتیں اور اذان فجر تک چلتیں۔ جس شخص کو اس قسم کا سفر عنفوان شباب سے لے کر عمر کے آخر دور تک پیش آیا ہو اور زندگی بسر کرنے کے جو اصول ہوتے ہیں ان سے غفلت کی ہو اس کا ۷۰ سال کی عمر میں مر جانا کوئی سانحہ نہیں اس عمر تک زندہ رہنا معجزہ تھا۔

شاہ جی ہندوستان کی تقسیم کے برگ و بار سے اتنے ملول تھے کہ روز بروز ان کی صحت ہلتی گئی۔ اس کے بعد اپنے آپ کو کبھی صحت مند نہ پایا ــــــ ختم نبوت کی تحریک ۱۹۵۳ء میں سکھر جیل میں تھے پہلی دفعہ معلوم ہوا ذیابیطس لگی ہوئی ہے۔ ۱۶ نومبر ۱۹۵۴ء کو نماز عشاء کے لئے وضو کر رہے تھے کہ انہیں اپنی انگلی پہ فالج کا اثر محسوس ہوا۔ فرمایا، میں کلمہ پڑھنے لگا اور انگلی پر لا نبی بعدی کا ورد کر کے پھونکتا رہا اللہ تعالیٰ نے فوراً شفا بخش دی۔

۲ جنوری ۱۹۶۱ء کو فالج کا دوسرا لیکن شدید حملہ ہوا اس حملہ سے بے بس ہو گئے،

# قید وبند

"زندگی ہی کیا ہے، تین چوتھائی ریل میں کٹ گئی، ایک چوتھائی جیل میں جتنے دنوں باہر رہا لوگ گلے کا ہار ہوتے رہے آج کلکتہ کل ڈھاکہ، ڈھاکہ سے لکھنؤ، لکھنؤ سے بمبئی پھر آگرہ، آگرہ سے دہلی، دہلی سے لاہور، لاہور سے پشاور، پشاور سے کراچی۔ ذرا ہندوستان کے دیہات اور قصبات کا اندازہ کر لو، ہر کہیں گھوما پھرا ہوں۔ سال کے تین سو پینسٹھ دنوں میں تین سو چھیاسٹھ تقریریں کی ہوں گی ؏

دن کہیں صبح کہیں شام کہیں رات کہیں

"میں نے تقریر کی لوگوں نے کہا "واہ شاہ جی واہ" میں قید ہو گیا لوگوں نے کہا "آہ شاہ جی آہ" اور واہ و آہ میں ہم ہو گئے تباہ۔!"

سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ

## اجتماعی قید

شاہ جی کی کل قید آٹھ اور نو سال کے لگ بھگ ہے، پہلی دفعہ آپ تحریک خلافت میں زیر دفعہ ۱۲۴ الف، ۱۴ مارچ ۱۹۲۱ء کو بمقام امرتسر پکڑے گئے اور تین سال با مشقت قید کی سزا پائی جو تمام بھگتی۔ دوسری دفعہ راج پال کے فتنہ کی سرکوبی میں ۶ جولائی ۱۹۲۷ء کو گرفتار ہوئے اور ایک سال کے لئے قید کر دیئے گئے۔ ۱۹۳۰ء میں کانگرس نے نمکین ستیہ گرہ کا

آغاز کیا تو مولانا ابوالکلام آزادؔ اور پنڈت موتی لال نہرو کی خواہش پر تمام ہندوستان کا دورہ کیا۔ خیبر سے کلکتہ تک پولیس نے تعاقب کیا لیکن آپ اسے جل دے کر نکل جاتے رہے۔ آخر ۳۰ اگست ۱۹۳۰ء کو دیناج پور میں پکڑے گئے اور ۲۰ اکتوبر کو چھ ماہ قید کا حکم سنایا گیا۔ یہ تمام عرصہ آپ نے علی پور اور ڈم ڈم جیل میں گزارا۔ ۱۹۳۲ء میں احرار نے تحریک کشمیر چلائی تو اس کی پاداش میں دھر لئے گئے اور دو سال جیل میں رہے۔

میرزائیت کا محاسبہ شروع کیا تو انگریزی عہد میں دو دفعہ پکڑے گئے، ایک دفعہ تو مسٹر جی ڈی کھوسلہ سیشن جج گورداسپور نے تا بہ اجلاس عدالت کی سزا دے کر چھوڑ دیا اور میرزائیوں کے خلاف ایک تاریخی فیصلہ لکھا۔ دوسری دفعہ قادیان میں داخلہ کی پابندی توڑی اور تین ماہ کے لئے سزایاب ہو گئے۔ ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگِ عظیم کے آغاز سے چند دن پیشتر سردار سکندر حیات کی وزارت نے $\frac{۳۰۲}{۱۱۷}$، ۱۲۱، ۱۲۴ اور ۱۵۳ الف ایسی سنگین دفعات کے تحت گرفتار کر لیا اور دو جگہ مقدمات دائر کئے گئے، راولپنڈی اور گجرات! لیکن پولیس رپورٹر لدھا رام نے بھانڈا پھوڑ کر وزارت کی سازش کو چوپٹ کر دیا۔ چھ ماہ جیل میں رہ کر بری ہو گئے۔

پاکستان میں تحریک ختم نبوتؐ کی پاداش (۱۹۵۳ء) میں پکڑے گئے۔ ۲۷ فروری ۱۹۵۳ء کو کراچی میں راتوں رات پولیس نے گرفتار کیا اور سندھ کی مختلف جیلوں میں سیکورٹی ایکٹ کے تحت محبوس رکھا۔ کوئی ایک سال بعد مرافعہ دائر ہونے پر لاہور ہائی کورٹ کے احکام سے چھوٹ گئے۔

مئی ۱۹۵۶ء میں آپ کو ملتان کے حدود میں سیفٹی ایکٹ کے تحت نظر بند کر دیا گیا۔ جولائی کے اواخر میں ڈاکٹر خان صاحب نے ان احکامات کو منسوخ کر دیا۔ خانیوال اور ملتان میں ۲۱ سیفٹی ایکٹ کے تحت دو مقدمے چلائے گئے مگر آخر سرکار نے واپس لے لیے۔

تک کہ شلجم کا اچار شہر بھر میں مشہور ہو گیا۔ تحصیل دار صاحب جدھر سے گزرتے لوگ بہانے بہانے شلجم کے اچار کا ذکر چھیڑ کر ان کو چڑاتے اور وہ چڑ کر گالیاں بکتے۔ لطیفہ نہایت دل کش تھا۔ دن بھر یاروں میں اس کا چرچا رہا۔ تین چار دن کے بعد دوستوں نے سازش کی کہ سید عطاء اللہ شاہ کو چڑایا جائے۔ چنانچہ سب سے پہلے صوفی اقبال احمد شاہ جی کی کوٹھڑی کے سامنے پہنچے اور انگشت شہادت سے اشارہ کر کے پوچھا، شاہ جی آپ کے پن ہوگی، شاہ جی نے کہا نہیں بھائی میرے پاس پن نہیں ہے۔ کوئی ایک منٹ کے بعد اختر علی خان پہنچے اور اس طرح انگشت شہادت کے پوروے سے اشارہ کر کے پوچھا کیوں شاہ جی آپ کے پاس پن ہوگی، شاہ جی نے ان کو بھی یہی جواب دیا کہ پن نہیں ہے۔ دو منٹ کے بعد ایک اور صاحب پہنچے، شاہ جی پن ہے؟ شاہ جی کے مزاج کا پارہ چڑھنے لگا۔ باہر نکل آئے اور کہنے لگے کیا تم سب کے ٹانکے ادھڑ چکے ہیں کہ باری باری آکر مجھ سے پن مانگتے ہو، اتنے میں ایک اور دوست پہنچ گئے اور نہایت متانت سے فرمانے لگے شاہ جی آپ کے پاس پن تو ہوگی؟ شاہ جی نے انہیں بُری طرح ڈانٹا اس کے بعد جو ہر طرف سے شاہ جی پن ہی کے سوالات شروع ہوئے تو شاہ جی اتنے غصے میں آئے کہ مادر و خواہر کی مغلظات تک سنا دیں۔ خیر ہم نے بڑی کوشش اور خوشامد درآمد سے ان کے غصے کو ٹھنڈا کیا اور بتایا کہ ہم تو صرف شلجم کے اچار والے لطیفے کو دہرا رہے تھے۔

## جیل یا کھیل

جو لوگ شاہ جی کے ساتھ جیل خانے میں رہے ان کا بیان ہے کہ شاہ جی قید کو کبھی سیریس (SERIOUS) نہیں لیتے تھے، جیل خانے کی چار دیواری میں ان کے قہقہے زیادہ وسیع ہو جاتے، اکثر ہندو نوجوان جو جیل میں ساتھ رہے آپ کی باغ و بہار طبیعت کے انتہائی گرویدہ تھے بالخصوص کمیونسٹ اور سوشلسٹ نوجوان جو ان کی شخصیت سے پیار کرتے لیکن خطابت سے خوف کھاتے تھے۔ مشہور ٹیررسٹ قیدی شیر جنگ نے ملتان سنٹرل جیل میں

آپ سے ترجمہ کے ساتھ قرآن پڑھا تھا، ایک دن اُس نے سوال کیا:

"شاہ جی، قرآن میں یہ تو درج ہے کہ مسلمان آزاد رہ کر اس طرح زندگی بسر کریں لیکن یہ کہیں درج نہیں کہ غلام ہوں تو کیونکہ زندگی گزاریں؟ سارے قرآن میں مسلمان اور غلامی کہیں بھی اکھٹے نہیں ہیں، آخر مسلمان جنگ آزادی میں حصہ کیوں نہیں لیتے"؟

یہ بات شاہ جی کے دل میں اُتر گئی۔ پھر کیا تھا مدت العمر عام جلسوں میں مسلمانوں سے اس کا جواب پوچھتے پھرے۔



ایک سوشلسٹ نوجوان نے جو آپ کے ساتھ قید میں تھا سوال کیا:

شاہ جی آپ نے کبھی نماز ترک نہیں کی اور نہ کبھی روزہ چھوڑا؟ پھر آپ کا دل عام نمازیوں کی طرح سخت کیوں نہیں؟

شاہ جی مسکرائے، فرمایا بھائی جو مذہب انسان کے دل کو گداز نہیں کرتا وہ مذہب نہیں سیاست ہے اور مجھے ایسی سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔

شاہ جی نے جیل میں مونج کوٹی، بان بٹا اور گندم پیسی لیکن عام طور پر مشقت سے بے نیاز ہی رہے، ایک زمانہ میں ٹوپی پہننا چھوڑ دی، کسی نے وجہ پوچھی فرمایا "پہلی دفعہ جیل گیا تو جیلر نے ہاتھ بڑھا کر ٹوپی اُتارنا چاہی، میں نے ہاتھ روک لیا اور اُتار کر خود حوالے کر دی تب سے فیصلہ کیا ہے کہ ٹوپی نہیں پہنوں گا۔ بس یہ جو گوشیہ رومال سر پر رکھتا ہوں۔

اب تو جیل خانوں میں کافی اصلاح ہو چکی ہے ایک زمانہ میں قیدی کو تین ماہ بعد ایک خط لکھنے اور دو ماہ بعد ایک خط وصول لینے کا حق ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک بڑا جبر تھا نتیجۃً بہت سے قیدی بیرنگ خط لکھتے جو بیرونی سنسر شپ کی وجہ سے پکڑے جاتے اور ان کی سزا کا موجب ہوتے، شاہ جی نے اس کا توڑ پیدا کیا۔ پنڈت کرپا رام برہم چاری کے نام سے اپنے احباب کو دینا ج پور جیل سے اکثر خط لکھتے رہے اور یہ نام سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری کا ترجمہ یا بدل تھا۔

# جماعت احرار

شاہ جی اور احرار میں گل و بلبل کا رشتہ تھا۔ جس طرح خطابت کے بغیر شاہ جی کا تصور نہیں بندھتا اسی طرح شاہ جی کی نفی سے احرار کی تاریخ نصف رہ جاتی ہے دونوں میں جسم و جان کا تعلق تھا۔

تحریک احرار بڑے ہی گہرے تجزیہ کی مستحق ہے جتنا گرد و غبار تاریخ احرار پر ڈالا گیا غالباً اس دور کی کوئی اور تحریک اتنی خاک بسر نظر نہیں آتی۔ اس کے خارجی وجوہ بہت سے ہیں لیکن داخلی وجہ خود احرار ہیں جتنی بڑی بڑی ناانصافیاں ان لوگوں نے خود اپنے ساتھ کی ہیں، ان کا عشر عشیر بھی دوسروں نے ان کے ساتھ روا نہیں رکھا۔ ان پر رسوائی کی منوں مٹی ڈالی گئی وہ دب گئے۔ لیکن مٹے نہیں، انہوں نے "قلم" کے اس دور کو بھی "زبان" کا دور سمجھا، ان کا خلاصۂ گفتار یہ تھا کہ حال پر جھنجلائیں، مستقبل کے خواب دیکھیں اور ماضی کے گیت گائیں، نتیجتہً ان کی سیاسی حیثیت ان مزارعین کی سی ہو گئی جو بنجر زمینوں میں ہل جوتتے ان کو پانی دیتے، فصل پکاتے، لیکن کٹائی کے وقت بیدخل ہو جاتے ہیں. یا ان معماروں کی طرح تھے جو عمارت تو کھڑی کرتے ہیں لیکن اس میں رہ نہیں سکتے۔

جماعت احرار کو پرکھنے کے لئے کئی ترازوؤں کی ضرورت ہے احرار کون ہیں؟ انہوں نے کیا کیا؟ ان کے مثبت و منفی کارنامے کیا ہیں؟ جب تک ہم سارے گردوپیش

صدمہ کی تاب نہ لاکر کئی ایک نوجوانوں نے خودکشی کرلی۔

ضلع میانوالی کی ایک تحصیل میں شاہ جی پہلی دفعہ تقریر کے لئے گئے تو کسی مسلمان نے اپنے ہاں نہ ٹھہرایا۔ ایک ہندو نے شب بسری کیلئے جگہ دی تو اسے گاؤں چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا۔ وہ تنگ آکر بھاگ نکلا، ازاں بعد اس کے مکان کو آگ لگا دی گئی۔

جس صوبہ کا حال یہ ہو اس میں کسی ایسی تحریک کی بنیاد رکھنا جس کی عنان شہر کے ادنیٰ متوسط طبقے کے ہاتھ میں ہو اور جو "اینٹی برٹش" ذہن بھی رکھتا ہو، ایک دلیرانہ اقدام تھا جس کے عواقب و نتائج کا صحیح اندازہ غالباً خود اس گروہ کو نہ تھا۔

## جماعت احرار کی بنیاد

جن لوگوں نے احرار کی بنیاد رکھی ان میں مولانا ظفر علی خان، مولانا داؤد غزنوی، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، چودھری افضل حق، مولانا مظہر علی اظہر، خواجہ عبدالرحمن غازی اور مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی پیش پیش تھے۔[1]

مولانا شوکت علی مرحوم نے ذاتی ناراضی کی بنا پر پنجاب میں خلافت کمیٹی کو غیر آئینی قرار دیا تو ان پنجابی راہنماؤں نے ۱۹۲۸ء کے اواخر میں علیحدہ تنظیم کے امکانات پر سوچ بچار کیا اور ۲۹ دسمبر ۱۹۲۹ء کو چودھری افضل حق مرحوم کی صدارت میں جماعت احرار کی بنیاد رکھی، سید عطاء اللہ شاہ بخاری پہلے صدر منتخب کئے گئے، دسمبر ۱۹۲۹ء میں کانگرس نے مکمل آزادی کا ریزولیوشن پاس کیا اور اپریل ۱۹۳۰ء میں نمکین ستیہ گرہ کا آغاز کر دیا۔ احرار ذہناً کانگرس کے ہمنوا تھے انہوں نے اپنی تنظیم کو ادھورا چھوڑا اور کانگرس میں شریک ہو کر سول نافرمانی میں حصہ لینے لگے، گاندھی اروِن میثاق کے تحت عفو عام کا اعلان ہوگیا تو پنجاب میں مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی کے سوا سب قیدی رہا کر دیئے گئے۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل کی صدارت میں آل انڈیا

---

[1] احرار اسلام کے خطبات اور قراردادیں ص ۱۲ ماخوذ "مسلمانوں کا روشن مستقبل" ص ۵۴۶

کانگرس کمیٹی کا سالانہ اجلاس کراچی میں ہوا تو اس اجلاس میں احرار راہنما ہندو بنیئے کے ضلعی انتخابات کا حشر دیکھ کر شریک ہوئے تھے اور انہیں ہندو سرمایہ کا تلخ تجربہ ہو چکا تھا۔ جب کراچی میں بھی صورت حالات موافق نظر نہ آئی تو علیحدگی کا ذہن اور پختہ ہو گیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی سوانح عمری میں کانگرس سے احرار کی علیحدگی کا سبب ورکنگ کمیٹی میں ان کے نمائندے کی عدم شرکت بیان کیا ہے لیکن چودھری افضل حق مرحوم و مغفور نے تاریخ احرار میں اسے پنڈت جی کی "کہہ مکرنی" کہا ہے۔

91

بہرحال جماعت احرار نے ۲ جولائی ۱۹۳۱ء اپنی پہلی کانفرنس حبیبیہ ہال لاہور میں منعقد کی، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کانفرنس کے صدر تھے، اس کانفرنس میں کانگرس کی سلسلہ روایت کے خلاف جداگانہ انتخاب کا مطالبہ کیا گیا ـــــ تو ہندو پریس نے آسمان سر پہ اٹھا لیا اور احرار کو کانگرس کا باغی قرار دے کر متہم کرنا شروع کیا۔

ہندوستان کی آزادی کے سوال پر احرار کا ذہن پہلے کی طرح کانگرس سے قریب تھا لیکن ہندو رہنماؤں اور ہندو اخباروں نے احرار کے خلاف اس شد و مد سے پروپیگنڈا کیا کہ پنجابی مسلمانوں میں ان کا وجود ایک فعال عوامی تنظیم کی صورت اختیار کر گیا اور یہ پہلا مرحلہ تھا جب مسلمانوں میں ہندوؤں سے علیحدگی کا ہمہ گیر ذہن ایک ایسی اجتماعی تحریک سے وابستہ ہو گیا جس نے جان گنتھر کے الفاظ میں مذہب کے راستہ عوام میں سیاسی رسوخ حاصل کیا تھا اور جس کا بدیہی نتیجہ مسلمانوں کا وہ جذبہ تھا جس نے ہندوؤں کی کوتاہ نظریوں سے مشتعل اور منضبط ہو کر پاکستان کی بنیاد رکھی۔ احرار جو کچھ کہتے رہے وہ تحریک پاکستان کے خلاف تھا جو کچھ کیا وہ پاکستان کے حق میں تھا۔

## تحریک کشمیر

احرار کی سیاسی زور آزمائیوں میں تحریک کشمیر کو اوّلیت حاصل ہے اس تحریک کے بہت سے برگ و بار تھے مثلاً تحریک کا ایک رُخ یہ تھا کہ:

۱ - تحریک خلافت کے بعد مسلمانوں نے پہلی دفعہ کسی تحریک میں اس جرأت سے حصہ لیا کہ چالیس پینتالیس ہزار کے قریب لوگ رضاکارانہ طور پر قید ہو گئے۔ کئی نوجوانوں نے جام شہادت نوش کیا۔

۲ - تحریک خلافت میں مسلمانوں کے ساتھ ہندو بھی شریک تھے اور اس تحریک کو تحریک لاتعاون کا اجتماعی ذہن حاصل تھا۔ لیکن تحریک کشمیر محض مسلمانوں کے بل پر اٹھی، اس میں حصہ لینے والے ننانوے فی صد ایک ہی صوبہ کے مسلمان تھے جنہیں ابتداً حکام ریاست کے علاوہ عام ہندوؤں اور نیشلسٹوں کا سامنا کرنا پڑا اور آخر میں برطانوی حکومت اور اس کے خود کاشتہ مسلمان امراء کے عناد کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔

۳ - ریاست کے اندرونی راہنماؤں بالخصوص شیخ عبداللہ وغیرہ نے کئی اسباب کی بنا پر احرار سے پہلوتہی کی لیکن بالآخر ذمہ دار حکومت کے اسی مطالبہ پر پہنچے جس سے بارہ برس پہلے انہیں اس لئے بھی اختلاف تھا کہ اس کے مجوز احرار تھے۔

۴ - اس تحریک نے ملک کی تمام ریاستوں کے استبدادی نظام کو ذہنی طور پر ہلا ڈالا۔ جس سے زمانہ شناس حکمرانوں نے مستقبل کے رجحانات کا واضح طور پر اندازہ کر لیا ریاستی باشندوں میں سیاسی شعور نے راہ پائی مزید برآں ان میں عزت نفس کا احساس پیدا ہو گیا۔

۵ - قادیانی جماعت کے سیاسی خدوخال کی صحیح وضاحت کا پہلی دفعہ سنگ بنیاد رکھا گیا۔

۶ - عام مسلمانوں میں اس ذہن کو نشوونما حاصل ہونے لگا کہ طبقاتی شعور ہی سرمایہ دار معاشرے کے بنیادی روگوں کا صحیح علاج ہے۔

دوسرا رُخ یہ تھا۔

۱ - حکام ریاست نے پہلے تو احرار کو نظر انداز کیا پھر ترغیب و تحریص کا دام پھیلایا جب یہ دونوں حربے ناکام ہو گئے تو اندرون ریاست کے راہنماؤں سے سمجھوتہ کر کے سطرفہ حملہ شروع کر دیا۔

فرستادہ لوگوں کی معرفت کام لے چنانچہ ان عناصر نے لیپا پوتی کر کے علامہ اقبالؒ کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی بنیاد رکھی، برطانوی سیاست کا سب سے کامیاب مہرہ میرزا محمود احمد صدر بن بیٹھا لیکن احرار مزاحم ہو گئے، انہیں اپنی علیحدہ جماعتی زندگی کی نیو اُٹھانے کے لئے سیاسی میدان چاہیئے تھا جو قدرت نے مہیا کر دیا۔ علامہ اقبال نے میرزا محمود احمد اور ان کی اُمت کے ہتھکنڈوں کو محسوس کرتے ہوئے احرار کی استدعا پر کشمیر کمیٹی سے استعفیٰ دے دیا۔ احرار اُٹھے اور چھا گئے۔ انگریزوں نے بوجوہ چُپ سادھ لی، امراء اشارہ پاتے ہی معاون بن بیٹھے، احرار نے غنیمت سمجھا اور ان سے دامے سخنے فائدہ اُٹھایا لیکن تنظیم سے الگ رکھا۔ آخر ریاست نے گھبرا کر ہتھیار ڈال دیئے، وائسرائے نے آرڈی ننس نافذ کر دیا جس سے تحریک کا رُخ بدل گیا۔ اُمراء واپس ہو گئے، صورتِ حالات کا نقشہ اس طرح ہو گیا کہ :

ا ۔ انگریز چالیس پینتالیس ہزار افراد کی رضاکارانہ اسیری کو مسلمانوں میں ایک ایسے ذہن کا نمو سمجھنے لگا جس کا اس سے پہلے اُسے اندازہ نہ تھا اور پنجاب میں تو اُسے مطلق یہ گوارا ہی نہ تھا۔

ب ۔ مسلمان امراء کو یہ طبعاً ناپسند تھا کہ اپنی گدیاں ان لوگوں کے لئے خالی کر دیں جنہیں وہ ازراہ تعریض کنگلے کہتے آئے تھے۔

ج ۔ خود مسلمان امراء نے آج تک یہ گوارا ہی نہ کیا تھا کہ مسلمانوں میں ایسی کسی عوامی تحریک کو اُبھرنے دیں جس کی باگ ڈور غرباء کے ہاتھ میں ہو یا اُن کا رسوخ بڑھے۔

د ۔ نواب اسماعیل میرٹھی کی معرفت وائسرائے نے چودھری افضل حق سے ملنا چاہا تو ان امراء نے احتجاج کیا کہ آپ فروتر لوگوں سے مل کر اپنے مرتبہ کو گھٹانے کی غلطی نہ کیجئے۔

۵ ۔ قادیانی جماعت کے لئے بدلہ چکانے کا یہ بہترین موقع تھا نتیجہ یہ نکلا کہ احرار کو اس سارے قضیہ میں اتنی بڑی قربانی کے باوجود شکست فاش ہوئی ریاست نے ہتھیار ڈال کر ہتھیار اُٹھا لیئے، انگریزوں نے احرار کو مٹا دینے کا فیصلہ کر لیا۔ مسلمان اُمراء نہ صرف

اُلٹے پاؤں بھاگ گئے بلکہ اس سوچ میں لگ گئے کہ احرار نے پنجاب میں جو اثر پیدا کیا ہے اس کو کس طرح ختم کیا جا سکتا ہے، ہندو شروع سے بیزار تھے ملک کی سب سے بڑی سیاسی تنظیم کانگرس نے احرار کو نافرمان سمجھ کر سیاسی اچھوت سمجھا۔ کئی مسلمان راہنما جو کبھی احرار کے ہم خیال یا ہم سفر رہے تھے احرار کی مقبولیت کو اپنی الگ شخصیتوں کے لئے مضر سمجھتے اور چاہتے تھے کہ احرار بہر صورت ختم ہو جائیں، غرض احرار خطرناک قسم کے سیاسی نرغے میں تھے۔

## تحریک کپور تھلہ

احرار کا دوسرا عوامی محاذ ریاست کپور تھلہ کی کسان تحریک (۱۹۳۳ء) تھا۔ ریاست نے خود مسلمان امرا کی معرفت اس تحریک کا گلا گھونٹ دیا وہاں وزیر اعظم مسلمان تھا اس نے ایک ہوشیار شاطر کی طرح صف آرا قوتوں کو چاروں شانے چت کیا۔ مگر احرار ہر حال میں ایک سیاسی طاقت بن چکے تھے لیکن ایک شہید گنج کے انہدام نے اس طاقت کو اس بُری طرح برباد کیا کہ پھر وہ سنبھالے تو لیتے رہے لیکن سنبھل نہ سکے۔ جس تیزی سے اُبھرے تھے اُسی سرعت سے پسپا ہو گئے۔

## کمیونل ایوارڈ

اواخر ۱۹۳۲ء میں کمیونل ایوارڈ کا اعلان کیا گیا تو گاندھی جی جیل میں تھے۔ اس ایوارڈ میں اچھوتوں کو ہندوؤں سے علیحدہ رکھا گیا، گاندھی جی نے اس علیحدگی کے خلاف مرن برت شروع کیا۔ گورنمنٹ نے گھبرا کر انہیں چھوڑ دیا۔ اس پر اچھوت راہنماؤں اور ان کے مابین پونا پیکٹ ہو گیا جو ریمزے میکڈانلڈ نے تسلیم کر لیا۔ اِدھر اس ایوارڈ میں مسلمانوں کو ان کے اکثریتی صوبوں میں پچاس فیصد سے ایک یا دو نشستیں زائد دی گئی تھیں۔ پنجاب کے ہندوؤں نے متحد ہو کر چلانا شروع کیا کہ اسلام راج قائم کر دیا گیا ہے۔ ماسٹر تارا سنگھ گوردوارہ تحریک کی کامیابی سے کچھ زیادہ ہی منچلے ہو گئے تھے انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ سے اعلان جڑ دیا کہ کمیونل ایوارڈ میں مسلمان راج کے جراثیم ہیں۔ اگر اسے بدلا نہ گیا تو سکھ خون کی ندیاں

بہا دیں گے۔ ماسٹر جی نے سکھوں کو گوردوگرنتھ پر حلف لینے کی تلقین کی ہر کہیں یہ حلف اُٹھایا گیا ——— شاہ جی انہی دنوں جیل سے رہا ہو کر آئے تھے۔ ماسٹر جی کی دھمکیاں پڑھیں تو امرتسر کے ایک جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

"ماسٹر جی ہمیں اپنی پایاب ندیوں سے ڈرائیں نہیں، غالباً وہ اس سے بے خبر ہیں کہ ہم خون کے قلزموں میں گھوڑے دوڑانے کے عادی ہیں"۔

شاہ جی کمر بستہ ہو کر نکل کھڑے ہوئے انہیں تحریک کشمیر کے تجربے میں ہندوؤں اور سکھوں کے اجتماعی ذہن نے پہلے ہی آزردہ کر رکھا تھا ایک ایک شہر اور ایک ایک قصبہ کا چکر کاٹا۔ تمام صوبے میں شاہ جی کی شعلہ نوائی نے سحر کا کام کیا۔ ماسٹر تارا سنگھ منقار زیر پر ہو گئے اور دوبارہ یہ لب و لہجہ کبھی استعمال نہ کیا۔

## میرزائیت کا تعاقب

احرار کا دوسرا بڑا محاذ میرزائیت کے خلاف تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ انگریزی حکومت کی ایک خود کاشتہ طاقت کو ایک ایسی بے ڈھب جماعت سے واسطہ پڑا جس نے نہ صرف مسلمانوں میں اس کی تبلیغی طاقت زائل کر دی بلکہ اس کے برطانوی چہرے سے نقاب اُلٹ دی اس مہم کی تائید میں بعض مؤثر آوازیں اُٹھیں۔ علامہ اقبال نے میرزائیت کو کھلم کھلا مسلمانوں سے الگ ایک مذہب اور فرقہ قرار دیا۔ پنجاب ہائی کورٹ کے ایک ریٹائرڈ جج جناب میرزا ظفر علی نے بھی میرزائیت کو آڑے ہاتھوں لیا۔ حیدر آباد کے ایک فاضل مؤلف جناب الیاس برنی نے "قادیانی مذہب" کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھی جس میں میرزا غلام احمد سے لے کر میرزا محمود احمد تک کی تحریروں سے ان کے مبادی و مقاصد، مطالب و عزائم اور رجحانات و میلانات کا کچا چٹھا پیش کیا ——— اس پر مسلمانوں کی بعض تعلیمی انجمنوں کو فیصلہ کرنا پڑا کہ میرزائی ان کے اداروں کے رکن نہیں ہو سکتے۔ اس صورت حالات سے میرزائیت اور اس کے اعوان و انصار گھبرا گئے۔ میرزا محمود احمد پیٹھ پیچھے خنجر بھونکنے میں یگانہ تھے انہوں نے خنجر کو آستین میں رکھا

اورگھات میں بیٹھ گئے۔ اِدھر پنجاب کے اُمراء کا طبقہ جن کی خصوصیتیں اُوپر بیان ہو چکی ہیں احرار کی تیز روی اور قبول عامہ کو اپنے لیئے مضر سمجھتا تھا۔ اس کے سامنے آئندہ کے الیکشن تھے ملک کو پہلی بار صوبائی خود مختاری حاصل ہو رہی تھی۔ مسلمانوں اور نامسلمانوں کی طاقت میں دو یا تین ووٹوں کا فرق تھا۔ اُمراء نہیں چاہتے تھے کہ اس فرق سے فائدہ اُٹھا کر احرار آگے بڑھیں اور اختیارات پر قابض ہو جائیں۔ خود انگریز اس معاملہ میں چوکنا تھا۔ پنجاب بہر حال اس کا قلعہ تھا اور برطانوی اقتدار کو اس کے خود کاشتہ اُمراء ہی تحفظ دے سکتے تھے۔

احرار اس سے خالی الذہن نہ تھے ان کے پیش نظر بھی انتخابات تھے اور سمجھتے تھے کہ طاقت کے بغیر کوئی تنظیم بھی مؤثر نہیں ہوتی ——— عجب نہ تھا کہ وہ شہری اور قصباتی نشستوں میں سے بیس پچیس نشستیں بہ آسانی حاصل کر لیتے لیکن میاں سر فضل حسین مرحوم انہیں شہ مات دینے میں کامیاب ہو گئے۔ گو وزارت عظمیٰ کا خواب میاں صاحب کی ناگہانی موت سے شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا لیکن مرنے سے پہلے وہ احرار کو شکست دے گئے۔ سردار سکندر حیات نے ان کی جگہ لی۔ پہلے تو احرار رہنماؤں سے دوستی گانٹھتے رہے تھے لیکن میاں صاحب کا جانشین ہوتے ہی طوطا چشم ہو گئے اور احرار کو فنا کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ اس کی تفصیلات اس کتاب کا حصہ نہیں ہیں۔

## شہید گنج کا قضیہ

شہید گنج کا قضیہ نامرضیہ اس ساری داستان کا ایک فراموش شدہ مگر عبرت ناک باب ہے، شہید گنج پر ایک زمانہ سے سکھوں کا قبضہ تھا اور وہ کسی صورت میں بھی اسے مسجد تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے بلکہ گوردوارہ شہید گنج کا ایک حصہ سمجھتے تھے ان کا دعویٰ یہ تھا کہ میر منو گورنر پنجاب نے بعض سکھوں کو یہاں قتل کیا یا تھا اور یہ ان کے مقتولین کی جگہ ہے۔ جب اکالی تحریک کے بعد گوردوارہ ایکٹ بنا اور اس ایکٹ کے بنانے میں میاں فضل حسین مرحوم و مغفور نے بھی اعانت کی تو شہید گنج کی ملکیت کا فیصلہ کرنے کے لئے ایک کمیٹی بنا دی گئی

ہے کہ انہدام مسجد میں اس وقت کے انگریز گورنر اور صوبائی بیوروکریسی کا پورا پورا ہاتھ تھا۔

۲۔ سکھوں میں داخلی طور پر دو دھڑے تھے۔ ماسٹر تارا سنگھ اور ان کے ساتھیوں کا گوردوارہ پر بندھک کمیٹی پر قبضہ تھا جو لوگ اندر خانے ان کے دھڑے کو شکست دینا چاہتے اور آئندہ انتخابات میں اپنی کامیابی کے لیئے پر تول رہے تھے۔ انہوں نے سرکاری سازش میں شریک ہو کر مسجد کے انہدام کا فیصلہ کیا۔ ماسٹر تارا سنگھ کو اس وقت خبر ہوئی جب مسجد گرنے لگی۔ انہوں نے مولانا داؤد غزنوی سے صورت حالات سمجھنے کے بعد سردار منگل سنگھ کو لاہور بھیجا کہ مسجد گرانے والوں کو روکیں۔ مگر حکام نے انہیں لنڈے بازار کے نکڑ پر روک لیا تا آنکہ مسجد ہموار ہو گئی۔ اب کوئی سکھ لیڈر بھی انہدام مسجد کی مذمت کر کے سکھ قوم میں اپنی شہرت کھونے کو تیار نہ تھا۔ سب اکھٹے ہو گئے اس کا فائدہ یونینسٹ پارٹی کے دست و بازو سر سندر سنگھ مجیٹھیا کو بھی پہنچا وہ اپنے بعض ساتھیوں سمیت انتخاب میں کامیاب ہو گئے۔ غرض پنجاب میں وزارت بنوانے کا جو نقشہ انگریزوں کے ذہن میں تھا وہ ان کی مرضی و منشا کے مطابق بن گیا۔

۳۔ سر میاں فضل حسین ہندوستان میں مسلمانوں کی جاگیردارانہ سیاست کے سب سے بڑے شاطر تھے۔ احرار نے سر ظفر اللہ خان کی مرکز میں نامزدگی پر میاں صاحب کو ہدف مطاعن بنا کر اپنا دشمن بنا لیا تھا۔ تمام خاندانی کاسہ لیس جو احرار کے قبول عامہ سے خائف ہو کر ان کے گرد جمع تھے شہید گنج کے انہدام پر ہڑ بڑا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ آن واحد میں مجلس عمل بن گئی۔ ایک بساط پر کئی مہرے جمع ہو گئے۔ جو لوگ مخلص تھے انہیں دھوکے میں رکھا گیا۔ ادھر احرار راہنما لاہور سے باہر تھے ان کی غیر حاضری میں سازش کا اختیاری و غیر اختیاری لائحہ عمل تکمیل پا گیا۔ چال یہ تھی کہ احرار راستہ سے ہٹ جائیں یعنی تحریک میں حصہ لیں تو مارے جائیں نہ حصہ لیں تو پٹ جائیں۔ دونوں صورتوں میں ان کے لیئے کربلا کا ایک میدان تھا اور انہیں مٹانے کیلئے متضاد و متباین عناصر اکھٹے ہو گئے تھے۔

گو رفتہ رفتہ انہوں نے اسٹیج پر قابو پالیا اور اپنی بات بھی کہنے لگے لیکن بہت کچھ کھو کر۔

اصلاً شہید گنج کے معاملہ میں ان سے ایک سیاسی غلطی ہو گئی اگر وہ شروع ہی میں حصہ لے کر اس کا رُخ پلٹتے تو زیادہ مفید نتائج پیدا ہوتے۔ انہوں نے کنارہ کشی اختیار کر کے حالات کا صحیح اندازہ نہ کیا جس سے مار کھا گئے۔

احرار کی اس بربادی کا سب سے زیادہ فائدہ ایک خاص دائرہ میں میرزا بشیر الدین محمود نے اُٹھایا۔ اس نے شروع سے آخر تک اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ جہاں کہیں اور جس طرح بھی احرار کو ضعف پہنچ سکتا تھا اس نے اس میں رتی بھر کمی نہ کی۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے مقدمہ میں میرزا بشیر الدین محمود کے خلاف مسٹر جی ڈی کھوسلہ سیشن جج گورداسپور کا فیصلہ ایک دو ٹوک محاکمہ تھا۔ یہ فیصلہ ۶ رجون ۱۹۳۵ء کو سُنایا گیا۔ کوئی ایک ماہ بعد شہید گنج کا سانحہ پیش آگیا، میرزا نے احرار دشمن متمردوں کی پشت پناہی کا بیڑا اُٹھایا، چنانچہ ایک روایت کے مطابق اس نے اس مہم میں کئی لاکھ روپیہ صرف کیا مگر ایک منفی فائدے کے سوا میرزائیت کو کوئی اثباتی فائدہ نہ پہنچا۔ عام مسلمانوں میں قادیانیت کا وجود ہمیشہ کے لئے مشتبہ ہو گیا، اس کے پیرو مسلمان عوام کے احتسابی نرغہ میں آگئے، مذہبی اعتبار سے ان کی محرومی دائمی ہو گئی، ان کا تجزیہ و محاسبہ ایک تحریک بن گیا اور یہ سب کچھ احرار کی بالواسطہ و بلاواسطہ مساعی کا نتیجہ تھا۔ اب میرزا صاحب اور ان کی مشینری کے اعضاء احرار پر شہید گنج کی مسجد کا ملبہ پھینکنے میں پیش پیش تھے۔

شاہ جی یار و اغیار کی ان نوازشوں سے دل برداشتہ بھی ہوتے اور صورت حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا مگر قلباً یہ رائے قائم کر لی کہ الیکشن بہت بڑا فتنہ ہیں۔ پھر طوعاً و کرہاً الیکشن میں حصہ لیا مگر علی الاعلان فرماتے الیکشن قومی زہر ہیں۔ جماعت کو الیکشن سے باز رکھنے کی ہر دفعہ کوشش کی لیکن جماعت کے "دماغ" اُن کی "زبان" کی پناہ تو لیتے مگر ان کے دماغ سے فائدہ نہ اُٹھاتے نتیجہ معلوم کہ انگریزی عہد کے آخری انتخابات (۱۹۴۷ء) میں

اور راقم الحروف دو برس تک قید تنہائی میں رکھے گئے، تمام عرصہ چکی پیسنے کو دی گئی۔ حکیم صاحب سی کلاس کی خوراک سے دمہ کے دائمی مریض ہو گئے۔ احسن عثمانی نے بھوک ہڑتال کی تو اس کی مقعد میں نالی گھسیڑ کر اسے نڈھال کر دیا گیا۔ آخر اس داخلی صدمہ کی تاب نہ لاکر وہ رہا ہوتے ہی موت کے منہ میں چلے گئے۔ راقم الحروف سے جو سلوک ہوتا رہا اس کی بہیمیت کا تذکرہ "پس دیوار زنداں" میں آگیا ہے جو راقم کے ایامِ اسیری کی سرگزشت ہے۔

چودھری صاحب کی موت کے بعد احرار کا سیاسی رُخ یکسر پلٹ گیا۔ چنانچہ اگست ۱۹۴۲ء میں کانگرس نے "ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک چلائی تو احرار نے حکومت الٰہیہ کا ریزولیوشن پاس کر کے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ احرار نہ کانگرس کے رہے نہ لیگ کے، دونو کی ہمسفری و ہم نوائی سے گریز کیا پھر جب حکومت الٰہیہ کا ریزولیوشن پاس ہوا تو اس وقت کئی احرار راہنما جیل میں تھے۔ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی جو احرار کے ہمیشہ سے صدر چلے آتے تھے ایک بے میعاد زمانہ نظر بندی دھرم سالہ جیل میں گزار رہے تھے۔

دراصل یہ احرار کے ایک ایسے ذہن کا اندازِ فکر تھا جو اینٹی برٹش ہونے کے باوجود کانگرس سے ہم آہنگ نہ تھا۔

جنگ ختم ہو گئی، اتحادیوں کو فتح ہوئی لیکن جن لوگوں کو ظالمانہ حد تک انگریز دشمن سمجھا جاتا تھا وہ ایک بڑا عرصہ پابند اور زبان بند ہی رہے۔ خود راقم الحروف اتحادیوں کی فتح کے ایک سال بعد تک نظر بند رہا۔

## مولانا محمد گل شیر کی شہادت

انہی دنوں احرار کو ایک اور وار سہنا پڑا۔ مولانا محمد گل شیر اپنے گاؤں جنڈ ضلع کیمبل پور میں رات کے وقت سوتے میں گولی مار کر شہید کر دیے گئے۔ ان کے قاتلوں کا سراغ کبھی نہ ملا۔ بہرحال ان کا قتل ایک سیاسی قتل تھا اور اس کے پس منظر میں وہ تمام رجحانات و میلانات تھے جن کا ذکر پنجاب کی خصوصیتوں کے ابتدائی ذکر میں آچکا ہے ــــــ مولانا جب تک

کی رفتار دیکھ کر فیصلے کرنا پڑتے ہیں وہ دل سے سوچنے کے عادی تھے ان کا جذبہ رفتہ رفتہ ضد بن چکا تھا اور اس ضد کو پروان چڑھانے میں بعض ایسے کوتاہ کار عناصر کی ایک خاص روش کا ہاتھ بھی تھا جو قربانی و ایثار، جذبہ و اعتقاد اور ایمان و اخلاص میں تو ان سے کوسوں پیچھے تھے لیکن اثر و رسوخ، دولت و ثروت اور جاہ و منصب میں منزلوں آگے تھے۔

## ماضی مرحوم

احرار ۱۹۴۶ء میں بھی ۱۹۲۰ء (تحریک خلافت) کے زمانے میں گھوم رہے تھے۔ حالانکہ زمانہ چھبیس برس آگے نکل چکا اور دو قومی نظریہ پیدا ہو کر جوان ہو گیا تھا۔ ان کا اعتقاد اور نظری سیاست پر [illegible] عام مسلمان عملی سیاست میں ڈوب چکے تھے۔ انہیں تاریخ کے اس عمل سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ کہ قوموں اور ملکوں کی سیاسیات میں خاص قسم کے معاشی حالات بھی حصہ دار ہوتے ہیں۔ یہی سبب تھا کہ مسلمان اعتقادات کی باتیں تو ان سے سن کر خوش ہوتے لیکن معاملات کے وقت ان کا رُخ ان لوگوں کی طرف ہوتا جو ان کے حقوق و مراعات کا نام لیتے اور ہمسایہ قوم کی مسلمان آزادی کا ذکر چھیڑتے تھے۔ انگریز اسلام اور ملک دونوں کا دشمن تھا لیکن مسلمانوں کے ہاتھ اتنے بلند نہ تھے کہ وہ اس کی آستین سے دشنہ و خنجر نکال لیں۔ ان کی نگاہیں روزمرہ کے ان چھوٹے چھوٹے واقعات کو دیکھ کر خشمگین ہوتی تھیں جن کا سرچشمہ ہمسایہ قوم کے لوگ تھے۔

## احرار اور لیگ

احرار کو غیر شعوری زعم تھا کہ وہ صورتاً یا سیرتاً اسلام سے قریب ہیں۔ ان کے ظاہر و باطن میں اس کے اثرات بھی تھے، لیکن لیگ کے راہنما مسلمان عوام کی روزمرہ کی زندگی میں گھس چکے تھے اور ان کی طبعی خواہشات کو متشکل کر کے اس کا نام پاکستان رکھ دیا تھا۔ پاکستان ابتداً ہندوؤں سے مسلمانوں کی اجتماعی ناراضگی کا اظہار تھا۔ رفتہ رفتہ ان کے اسلامی لیکن مادی تقاضوں کا مظہر ہو گیا۔ احرار پاکستان کے مجوزین کی طبقاتی سیرت اور سیاسی کردار کو زیر بحث

لاکر اپنے جائز خدشات کا منفی طریق سے اظہار کرتے تھے۔ انہیں اس سے غرض نہ تھی کہ مسلمان عوام کیا چاہتے ہیں وہ صرف اس سے بحث کرتے تھے کہ جن کی معرفت چاہتے ہیں وہ کون ہیں؛ چودھری افضل حق مرحوم نے انہیں آخری ایام زندگی میں متنبہ بھی کیا تھا کہ پاکستان کی مخالفت نہ کرنا دکھی دلوں کی فریاد ہے لیکن ان کی جذباتی سیاست نے اپنے ہی قائد کی بات کو آویزہ گوش بنانے سے گریز کیا۔

## وجہ مغائرت

ضدیوں پیدا ہوئی کہ لیگ کے دولت مند اکابر ان کی غریبی پر طعن توڑتے اور انہیں (108) دوؤں کا زر خرید کہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایک سچا دل گالیوں کی اجتماعی یلغار سے بگڑے گا۔ پھر یہ بگاڑ اس صورت میں اور بھی مضبوط ہوتا ہے جب گالی دینے والا خود گالی ہو اور الزام لگانے والا فی نفسہٖ الزام ہو۔ احرار نے کس مپرسی، غصے، جھنجھلاہٹ اور ضد میں پاکستان کے ملی موقف کی اہمیت کو نظر انداز کر کے نہ صرف لیگ کے رہنماؤں سے محاذِ جنگ قائم کر لیا بلکہ اس وقت انتخاب میں کود پڑے۔ جب قومی مستقبل کے سوال پر محض انتخاب ہی نہیں استصواب ہو رہا تھا۔

۱۹۴۶ء کے انتخاب میں حصہ لینا احرار کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ بعض اجزائے جماعت نے ضد میں آکر یونینسٹوں کا ہاتھ بٹایا۔ جس سے احرار کے اجتماعی وقار کو سخت دھکا لگا لیکن اس میں عام احرار یا اکابر احرار کا کوئی حصہ نہ تھا۔ چودھری صاحب کی موت کے بعد احرار کے قائد مولانا مظہر علی اظہر تھے جن کا انفرادی ذہن احرار کا جماعتی ذہن سمجھا جاتا تھا —— چونکہ احرار راہنماؤں میں سیاسی اصولوں کے بجائے ذاتی دوستیوں کا میلان ہی غالب رہا اس لئے ایک کی بات پر سب طوعاً یا کرہاً سر جھکا دیتے تھے —— شاہ جی ”انتخابی یدھ“ میں حصہ لینے کے سخت خلاف تھے جب جماعت کا فیصلہ ہوا اور مولانا مظہر علی اظہر نے پہلی انتخابی تقریر کی تو شاہ جی سری نگر میں تھے۔ مولانا کی تقریر کے ایک ماہ بعد لاہور

تشریف لائے تو نہ صرف انتخاب لڑنے کے فیصلے پر ناراض ہوئے بلکہ مولانا مظہر علی اظہر سے اپنے مخصوص انداز میں فرمایا کہ "آپ نے سیاسیات میں ذاتیات کو لاکر ایک بری مثال قائم کی ہے، براہِ کرم آئندہ اس موضوع سے پرہیز کیجئے" ——— اب یہ کوشش کی گئی کہ شاہ جی بھی انتخابی مہم میں حصہ لیں۔ شاہ جی نے یونینسٹوں پر تو تبریٰ بھیجا لیکن اتنا بہ منت راضی ہو گئے کہ صرف آزمودہ احرار اُمیدواروں ہی کے حلقہ ہائے انتخاب میں جائیں گے۔ اس زمانے میں آپ نے جو تقریریں کیں اس میں مستقبل کے خدشات بالتفصیل بیان کئے لیکن رنگینی و شیرینی کا وہ انداز ناپید ہی رہا جو زبان و دل کے متحد ہونے سے پیدا ہوتا ہے ؎

ہزار خوف ہوں لیکن زباں ہو دل کی رفیق

یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

انتخاب میں احرار کو متوقع شکست ہوئی ان کا ایک اُمیدوار بھی کامیاب نہ ہو سکا۔ تھوڑے دنوں بعد شاہ جی کو بعض ناگفتہ بہ حقائق کا پتہ چلا تو سخت دل برداشتہ ہوئے بلکہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

ادھر وزارتی مشن ہندوستان پہنچ چکا تھا۔ احرار راہنماؤں کا وہ قبیلہ جس کی دوستی قابلِ رشک سمجھی جاتی تھی اپنے اندرونی اختلافات کے باعث بٹنے اور بکھرنے لگا۔

مولانا ظفر علی خاں اور غازی عبدالرحمٰن ۱۹۳۱ء ہی میں الگ ہو گئے تھے، وہ صرف نیو اُٹھانے میں شریک ہوئے تھے اور بس، تحریک شہید گنج کے بعد مولانا داؤد غزنوی نے بھی ذہنی علیحدگی اختیار کر لی اور ۱۹۴۰ء کے وسط میں کانگرس میں چلے گئے۔ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے رہا ہوتے ہی شملہ کانفرنس کے موقع پر اعلان کر دیا کہ ان کے لیڈر مولانا ابوالکلام آزاد ہیں۔ احرار سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ تقسیم ہندوستان کے بعد انہوں نے دہلی میں مستقلاً سکونت اختیار کر لی اور بھارتی شہری ہو گئے۔ ۱۹۶۰ء میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔

مولانا مظہر علی اظہر نے ۱۹۴۷ء کے شروع میں احرار سے استعفیٰ دے دیا اور

انفرادی طور پر پاکستان کی حمایت کرنے لگے۔ پاکستان بنا تو شاہ جی نے جماعت کے نام ایک خط لکھا کہ احرار کو اپنی سیاسی حیثیت ختم کر دینی چاہیئے۔ کچھ دنوں بعد احرار کا ایک ایسا گروہ لیگ کی طرف راجع ہونے لگا جس میں سیاسی شکست خوردگی کا احساس نمایاں تھا۔ غالباً ۱۹۴۹ء میں ایک کھلی کانفرنس منعقد کر کے احرار نے لیگ میں ادغام کا اعلان کیا اور جماعت تبلیغی بنا دی۔ اس تبلیغی تنظیم نے قادیانیت کی سرکوبی شروع کی۔ رفتہ رفتہ پاکستان کے سبھی علماء ہم نوا ہو گئے، اس ہمنوائی نے قادیانیت کے خلاف ایک مضبوط محاذ کی صورت پیدا کی، فروری ۱۹۵۳ء میں "راست اقدام" کی آگ بھڑک اٹھی، حکومت کو لاہور میں مارشل لاء نافذ کرنا پڑا ——— اواخر دسمبر ۱۹۵۴ء میں حکومت پنجاب نے مجلسِ احرار کو خلافِ قانون قرار دے کر سامان وغیرہ پر قبضہ کر لیا دفاتر سر بمہر کر دیئے، کئی سال بعد نواب مظفر علی قزلباش ون یونٹ کے وزیر اعلیٰ ہوئے تو انہوں نے ۱۸ اگست ۱۹۵۸ء کو یہ پابندی ختم کر دی۔ لیکن احرار میں جو لوگ مذہبی اور دینی مزاج و طبیعت رکھتے تھے انہوں نے شاہ جی کی قیادت میں مجلسِ تحفظ ختم نبوت کی بنا ڈالی اور قادیانیت کے خلاف سرگرم ہو گئے جن کے پیش نظر شروع ہی سے امور سیاست تھے۔ وہ عوامی لیگ میں چلے گئے لیکن بھاری پتھر تھا اٹھ نہ سکا چوم کے چھوڑ دیا۔ اُدھر خلاف قانون ہو کر بھی احراری ذہن علیٰ حالہ قائم رہا۔ پنجاب کے شہروں میں نہ صرف اس کے مضبوط حلقے تھے بلکہ سیاسی طور پر بھی ان میں ایسا استحکام اور انضباط تھا جس نے حوادث و افکار کی طویل گردشوں کے لیے ایک قبیلوی عصبیت کا درجہ حاصل کر لیا تھا ——— مندرجہ بالا تصریحات کا تجزیاتی خلاصہ یہ ہے۔

## خلاصۂ احرار

۱۔ احرار پنجاب کے ادنیٰ متوسط طبقے کے شہریوں کی ایک ایسی تحریک تھے جس میں جوش و جذبہ فزا فر تھا۔ وہ لیگ کے ہمہ گیر سیاسی ذہن اور کانگرس کی ہمہ گیر تنظیم کے مقابلہ میں سیاسیات و مذہبیات کے ترکیبی عناصر کا ایک جانثار اور جان بار مجموعہ تھے ان میں وسعت اور تنوع

ایسی تحریک میں رہنمایانہ حصہ لیتے تو نظم و مسلک مسلمانوں میں مذہبی دیوانگی کے سزاوار ہوتے۔

الغرض انگریز، ہندو اور مسلمان تینوں اپنے دوائر میں ان کے خلاف تھے۔

۸۔ احرار کسی خاص فکر ہی تحریک کے مظہر نہ تھے، مگر ایجی ٹیشن برپا کرنے اور پروپیگنڈا



رچانے کے فن میں بے مثال تھے۔

۹۔ ان کے نظریات میں رومانی تضاد تھا مثلاً سیاست میں اینٹی برٹش ذہن کے وارث، مذہب میں حکومت الٰہیہ کے مبلغ، ثقافت میں اسلامیات کے دلدادہ، معاشیات میں دولت کی برابر تقسیم کے داعی، غرض ان کی تقریروں کا لب لباب قرآن و حدیث اور تاریخ و سیرت کا مرکب ہوتا اور مذہب ہی کے نام پر مسلمانوں سے مخاطب ہوتے۔



۱۰۔ انہوں نے احتجاجی سیاسی ذہن پیدا کیا لیکن تنظیم نہیں۔ چودھری افضل حق مرحوم سے زندگی وفا کرتی تو ممکن تھا وہ تنظیم کو خدائی خدمت گار تحریک کے ہم پایہ بنا لیتے لیکن ان کی موت کے بعد جماعت کا یہ پہلو کمزور ہو گیا۔ شاہ جی جوڑ توڑ کے آدمی نہیں تھے وہ ایک رواں دواں انسان تھے۔

۱۱۔ احرار نے ساری زندگی شہروں یا قصبوں کو اپنی جدوجہد کا مرکز بنائے رکھا۔ دیہات کا رخ دیر بعد کیا لیکن تبلیغی حیثیت سے! مرزائیت کے خلاف، اصلاح الرسوم اور بدعات کی بیخ کنی کے لئے یا پھر سیرت کے جلسوں میں!

شاہ جی مدت تک لوگوں کو السلام علیکم کہنا سکھاتے رہے۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج کے مسائل پر مسلسل وعظ کئے مگر لوگوں کے معاشی یا مجلسی مسائل کو تنظیمی اعتبار سے چھوا تک نہیں البتہ پنجابی مسلمانوں کو تجارت کی راہ پر لانے میں شاہ جی اور احرار نے عظیم خدمات انجام دیں۔

۱۲۔ احرار میں قربانی، احتجاج، حوصلہ اور خطابت کا جوہر وافر تھا، لیکن فکر، نظر کسوٹی اور قیادت کا تناسب مقابلتاً

۱۳ - ان کی سب سے بڑی کمزوری وسائل کا فقدان تھا جو کچھ تھے اپنے ہی اندر تھے، ان کی "سپلائی لائنیں" خارج میں نہ تھیں۔ وہ فقر و فاقہ اور جوش و غضب کا ہراول دستہ تھے۔

۱۴ - انہیں امراء کے ذہن سے حد درجہ تنفر تھا اس تنفر ہی کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے تحریک پاکستان کو عوام کی بجائے خواص کے آئینہ میں دیکھا اور یہ ہمیشہ اس بات پر زور دیتے رہے کہ :

" جن لیگیوں اور کانگریسیوں کو سیاسی اور اقتصادی مساوات سے گھن آتی ہے وہ سُن لیں کہ وہ ہمارے دینی بھائی ہیں، نہ وطنی۔ وہ لیڈروں کا ذہن رکھتے ہیں ان کا اور احرار کا ساتھ نبھ نہیں سکتا ——— ہم سے یہ سوال کیا جاتا ہے کہ تم تقسیم ہند کے قائل ہو؟ ہم اس سوال کا جواب دینے سے قبل سائل سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ تم دولت کی منصفانہ تقسیم کے قائل ہو؟ اگر قائل ہو تو پھر ہندوستان ایک طرف رہا ہم شہروں کی تقسیم کے بھی قائل ہیں لیکن ہم اس کے سخت خلاف ہیں کہ لاکھوں مسلمانوں کی قربانی دے کر کسی یزید جیسے مسلمان کے لئے تخت سلطنت بچھایا جائے۔" (تاریخ احرار صفحہ ل م) جان گنتھر کے نزدیک احرار مذہبی اعتبار سے فرقہ پسند فدائی اور سیاسی اعتبار سے انتہا پسند سیاستین تھے (دورِ حاضر کا اسلام) لیکن ماڈرن اسلام ان انڈیا ——— کے مصنف مسٹر ولیفریڈ سی سمتھ کا خیال تھا کہ احرار ہندوستان ہی نہیں بلکہ دنیائے اسلام کی پہلی مسلم سوشلسٹ تحریک ہیں"۔

ان محاسن و معائب کے پس منظر میں احرار کی پوری تاریخ سامنے آجاتی ہے افسوس ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی اتنی بڑی تحریک کس بے دردی سے برباد ہوگئی ——— تاہم ایک مورخ واقعات کی چھان پھٹک کے بعد اس نتیجہ پر ضرور پہنچتا ہے کہ احرار نے جس ذہن کی آبیاری کی اس کی بہت سی شاخیں ثمر آور ہوئیں، مثلاً

ا - مسلمان نوجوانوں کی ایک بڑی جماعت میں خلاف سامراج ذہن پیدا کیا جو پختہ ہو کر ان کی فطرت ہوگیا۔ اس سے متاثر ہونے والے زیادہ تر درمیانے درجے کے مفلوک الحال

# میرزائیت

## پاکستان سے پہلے



مسلمانوں اور میرزائیوں میں ٹکراؤ کی جو صورتیں پیدا ہوتی رہی ہیں اُن کی بنیاد اس دن رکھی گئی جب ۱۸۸۰ء میں میرزا غلام احمد نے اپنے ملہم من اللہ ہونے کا دعویٰ کیا[1]۔ اسی سال آپ نے "براہین احمدیہ" لکھی جس میں اپنے مجدد ہونے کا اعلان کیا۔ یکم دسمبر ۱۸۸۸ء کو آپ نے اعلان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں بیعت لینے کا حکم فرمایا ہے۔ ۱۸۹۱ء میں اپنے مسیح موعود ہونے کا انکشاف کیا اور "ظلی نبی" کی مصطلح ایجاد فرمائی۔ نومبر ۱۹۰۴ء میں آپ نے سیالکوٹ کے ایک جلسۂ عام کو خطاب کرتے ہوئے "مثیل کرشن" ہونے کا دعویٰ کیا پھر فرمایا کہ آپ ہر مذہب کے اوتار ہیں۔ ۲۶ مئی ۱۹۰۸ء کو آپ کا انتقال ہو گیا۔

اس اثناء میں (۱۸۸۰ء سے لے کر ۱۹۰۸ء تک) جن مقاصد و مصالح کی آبیاری کی گئی ان کے برگ و بار کا خلاصہ یہ ہے۔

اولاً میرزا صاحب نے عیسائی مشنریوں سے مناظروں کی بنا رکھ کر مسلمانوں کی ذہنی زندگی کو ایک ایسے الجھاؤ میں پھنسا دیا جس کا بدیہی نتیجہ ان حالات میں انگریزی حکومت کی مصلحتوں

---

[1] دیکھو ریویو آف ریلیجنز بابت مئی ۱۹۰۶ء نمبر ۵ جلد ۵ صفحہ ۱۶۴۔

کے لیئے نفع آور تھا۔

ثانیاً آریہ سماجیوں سے تو تکار کی راہ پیدا کی چنانچہ سب سے پہلا مناظرہ آپ نے اوائل مارچ ۱۸۸۶ء میں لالہ مرلی دھر آریہ سماجی سے ہوشیار پور میں کیا وہاں پہلی دفعہ اُس دشنام و تعریض کی بنا رکھی گئی جس نے آئندہ چل کر راجپال اور بعض دوسرے شاتم رسول پیدا کئے اور یہ سب میرزا صاحب کے مباہلوں کا قدرتی نتیجہ تھا کہ اس کا فائدہ برطانوی حکومت کے تفریقی مقاصد کو پہنچتا تھا اور یہ حقیقت ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خلاف بدگوئی کی مہم کا سبب میرزا صاحب کے یہی مباہلے اور مجادلے تھے۔ آخر علماء کے ایک گروہ میں ظلی نبوت کے دعویٰ کی مزاحمت شروع ہو گئی، مولوی محمد حسین بٹالوی جو میرزا صاحب کے دعویٰ نبوت سے پہلے عیسائیوں اور آریوں سے مناظرے کرتے اور تنسیخ جہاد کی جدوجہد میں آپ کے ساتھ رہے تھے ایکا ایکی فرنٹ ہو گئے۔ عام مسلمانوں میں ایک ہیجان سا پیدا ہو گیا۔

جن لوگوں کو آپ کے خد و خال کا قریبی علم تھا انہوں نے جوابی فتوے صادر کئے یہ فتوے پہلے پہل ۱۸۹۰ء میں جاری کئے گئے۔ سب سے پہلا فتویٰ لدھیانہ کے علماء نے جاری کیا جن میں مولانا محمد عبداللہ اور مولانا عبدالعزیز رحمہم اللہ تعالیٰ پیش پیش تھے۔ ان کی تائید میں مولوی سید نذیر حسین صاحب محدث دہلوی نے فتویٰ صادر کیا پھر دہلی، آگرہ، حیدرآباد اور بنگال کے علماء نے فتاویٰ جاری کئے تا آنکہ میرزا صاحب کی مہدویت اور نبوت مسلمانوں میں نزاع کا باعث ہو گئی دونو طرف مباحثوں کا بازار گرم ہو گیا اور وہ توجہ جو انگریزوں کی طرف تھی میرزا صاحب کی طرف منتقل ہو گئی یا انہوں نے اپنی طرف پھیر لی۔ میرزا صاحب نے ظلی نبوت کے جو کمالات دکھائے اس کی فصاحت و بلاغت کے نمونے آئندہ صفحات میں ضمنی مباحث کی مناسبت سے پیش کئے جا رہے ہیں۔

## مقدمہ بازی

ان مباحثوں اور مباہلوں کا ایک نتیجہ اور نکلا کہ نوبت مقدمہ بازی تک جا پہنچی۔ سب

سے پہلا مقدمہ پادری کلارک نے کیا اس نے الزام لگایا کہ میرزا صاحب نے اپنے کسی الہام کی سچائی ثابت کرنے کے لیے ایک شخص عبدالحمید کو ان کے قتل پر مامور کیا ہے۔ دوسرا مقدمہ پولیس نے ۱۸۹۸ء میں ایک پیشین گوئی کی بنا پر دائر کیا جس میں مولانا محمد حسین بٹالوی کا رشتۂ حیات منقطع کیے جانے کا اشارہ تھا۔ اسی طرح ۱۹۰۲ء کے آخر میں ایک مسلمان نے جہلم میں دو مقدمے دائر کیے۔ ہر مقدمہ میں میرزا صاحب چھوڑ دیے گئے۔ آریوں سے مناظروں میں بدگوئی کی سزا میرزا صاحب کے بجائے اسلام کو بھگتنی پڑی چنانچہ ستیارتھ پرکاش کا پہلا ایڈیشن جو ۱۸۷۵ء میں راجہ جے کشن داس سی ایس آئی کے زیر اہتمام بنارس میں چھپا تھا اور جس کے حقوق سوامی دیانند نے ان کے ہاتھ فروخت کر دیے تھے ابتدا بارہ ابواب پر مشتمل تھا۔ اس میں تیرھویں اور چودھویں باب کا اضافہ میرزا صاحب کی ان تحریروں کے بعد ہوا جن میں آریوں کے نیوگ ایسے معاشرتی مسئلے کو چھیڑ کر ان کا مذاق اڑایا گیا اور ان کے بعض عقائد کو مضحک قرار دیا گیا تھا، سوامی دیانند ۳۰ اکتوبر ۱۸۸۳ء کو انتقال کر گئے تو میرزا صاحب نے ان کی موت کو بھی اپنی پیش گوئیوں سے وابستہ کر لیا۔ چنانچہ ان کی رحلت کے بعد ستیارتھ پرکاش کا جو دوسرا ایڈیشن چھپا، اس میں تیرھویں اور چودھویں باب کا اضافہ تھا جن میں خدا اور رسول پر رکیک حملے کیے گئے تھے، ایک میرزائی قاسم علی نے انیسویں صدی کا مہاشی دیانند شائع کی جس میں آریہ سماج کے بانی کو چتھاڑا اسی کا نتیجہ تھا "رنگیلا رسول" (خاکم بدہن) جس کے مصنف پنڈت چمپاوتی ایم اے پروفیسر ڈی اے وی کالج لاہور اور ناشر مہاشہ راجپال تھے۔[1]

غلام احمد کو ان کی زندگی ہی میں ان دعویٰ ہائے مہدویت اور نبوت کی بنا پر گھیر لیا گیا۔ گو ان کے دعاوی کو پڑھے لکھے لوگوں میں محض مسخرے پن سے تعبیر کیا گیا مگر عام مسلمانوں

---

[1] مولانا مظہر علی اظہر کی کتاب ستیارتھ پرکاش اور میرزا غلام احمد میں تفصیلات ملاحظہ فرمائیں۔

نے ان دعاوی سے اجتماعاً کوئی دلچسپی نہ لی۔ ان کے تعاقب میں مولوی ثناء اللہ امرتسری نے بڑا نام پیدا کیا، لیکن میرزا صاحب کی وفات کے بعد اصل خرابی میرزا محمود احمد کے عہد میں شروع ہوئی۔ حکیم نور الدین خلیفہ اوّل کا انتقال ہو گیا تو میرزا محمود احمد مصلح موعود کا لبادہ اوڑھ کر بزعم خویش عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن بیٹھے۔

پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) سے لے کر دوسری جنگ عظیم (۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۵ء) کے آغاز تک میرزائیت ایک بندھی اور لپٹی ہوئی چیز کی طرح خود بخود کھلتی اور بکھرتی چلی گئی۔ عامۃ الناس کو رفتہ رفتہ معلوم ہو گیا کہ میرزائیت کا مافی الضمیر کیا ہے؟ اور اس کے ظاہری و باطنی وجود میں کس قدر تفاوت یا مطابقت ہے؟ حکیم نور الدین کی حیات تک عام لوگوں میں اس کا تبلیغی کردار ہی نمایاں رہا۔ لیکن میرزا محمود احمد کی خلافت نشینی نے چہرے کی تمام نقابیں اٹھا دیں اور لوگ غالباً پہلی دفعہ پہچاننے لگے کہ اس تبلیغ کے پس منظر میں جو تنظیم قائم ہوئی ہے اس کو ایک سیاسی تحریک بنانے میں کون عوامل و عناصر کا ہاتھ ہے۔

چنانچہ پہلی جنگِ عظیم میں اتحادیوں بالخصوص انگریزوں کی فتح پر اس تحریک یا تنظیم نے جو کارنامے سرانجام دیئے اور خلافتِ عثمانیہ کے سقوط پر جس مسرت کا اظہار کیا اس سے مسلمانوں کے کان کھڑے ہو گئے اور مسلمانوں کی سیاسی تحریکوں کے دینی راہنماؤں نے پہلی دفعہ میرزائیت کا سنجیدگی کے ساتھ مطالعہ شروع کیا۔

## مولانا ظفر علی خاں کی مزاحمت

اس وقت تک میرزا غلام احمد کے بارے میں عوام و خواص کی معلومات زیادہ تر سماعی تھیں اور لوگ نظر بظاہر انہیں اسلام کا ایک مبلغ و مناظر سمجھتے تھے اور ان کی جماعت کو بوجوہ ایک تبلیغی جماعت لیکن اسلامی ملکوں کی تاخت و تاراج پر میرزائیوں نے جو چراغاں کیا اس سے عام مسلمان نہ صرف برگشتہ ہو گئے بلکہ میرزائیت کا توڑ قرآن و حدیث سے کیا جانے لگا۔ اس وقت میرزائیت کی سیاسی کارگزاریوں کو بوجوہ چیلنج نہیں کیا گیا بلکہ اس

کی مذہبی عمارت کو ڈھانے کے لیئے مذہب ہی کو واسطہ بنایا گیا۔ لیکن رفتہ رفتہ مزاحمت کا جوذہن تحریک بن گیا۔ اس کے داعیٔ اوّل مولانا ظفر علی خان مدیرِ زمیندار تھے مولانا نے میرزائیت کے خلاف جمہور المسلمین میں ہنگامہ برپا کر دیا اور میرزائیت کو شہروں سے بھاگ کر دیہات میں پناہ لینی پڑی ——— مولانا نے تردیدِ میرزائیت کے ضمن میں بعض طویل اور گراں قدر مقالے لکھے۔ جو غالباً ۱۹۳۳ء یا ۱۹۳۴ء میں بعض فکاہی نظموں کے ساتھ "ارمغانِ قادیان" کے نام سے اشاعت پذیر ہوئے۔ کہا جاتا ہے اس کتاب کی تمام جلدیں میرزائیوں نے اپنے ایجنٹوں کی معرفت خرید کر جلا دیں اور مولانا اختر علی خان کو آئندہ اشاعت سے باز رکھنے کے لیئے رام کر لیا، مولانا ظفر علی خان کی پیدا کی ہوئی اس عوامی تحریک کو اسی جوش و ہیجان کے ساتھ بعض سیاسی اور دینی حلقوں نے اپنانا شروع کیا چنانچہ چودھری افضل حق مرحوم نے بعض تلخ سیاسی تجربات کی بناء پر احرار رفقاء کو آمادہ کیا کہ وہ اس تحریک کو ہاتھ میں لے کر قادیانیت کی اجتماعی منزلوں کا جماعتی مقابلہ کریں۔

## احرار کی جماعتی مزاحمت

شاہ جی نے میدانِ مبارزت کی کمان خود سنبھال لی یہ پہلا موقعہ تھا کہ میرزائیت کو ایک سخت جان طاقت سے مقابلہ کرنا پڑا جس کی پاداش میں احرار کو صعوبتوں پر صعوبتیں سہنی پڑیں حتیٰ کہ مذہب کے اس محاذ کا خمیازہ انہوں نے سیاسی محاذ کی پے در پے ناکامیوں میں بھگتا۔ لیکن میرزائی حملوں اور برطانوی مزاحمتوں کے باوجود میرزائیت اور اس کے پیرووں کو احرار نے ایک ایسی پوزیشن میں لا کر کھڑا کیا کہ :

۱۔ عام مسلمانوں میں ان کا وجود اعتماد سے خارج ہو گیا۔

۲۔ ان کے تبلیغی دروازے بری طرح بند ہو گئے۔

۳۔ انہیں مذہباً مسلمانوں سے خارج سمجھا جانے لگا اور سیاستہً برطانوی اقتدار کا مہرہ، جس کا اقرار خود میرزا محمود احمد نے اپنے بہت سے خطبوں میں کیا ہے، مثلاً :

"ہماری جماعت وہ ہے جسے شروع ہی سے لوگ کہتے چلے آتے ہیں کہ یہ خوشامدی اور گورنمنٹ کے پٹھو ہیں، بعض لوگ ہم پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ ہم گورنمنٹ کے جاسوس ہیں، پنجابی محاورہ کے مطابق ہمیں "جھولی چک" اور نئے زمینداری (غالباً اخبار "زمیندار" مراد ہے) محاورہ کے مطابق ہمیں "ٹوڈی" کہا جاتا ہے۔"

(خطبہ میرزا محمود احمد
الفضل قادیان جلد نمبر ۲۲
نمبر ۵۸ مورخہ ۱۱ نومبر ۱۹۳۴ء)

۴۔ احرار کی مزاحمت سے پہلے نئی نسل کے انگریزی پڑھے لکھے مسلمانوں کی ایک جمعیت میرزائیوں کے تبلیغی جلسوں میں شریک ہو کر ان کی بالواسطہ تقویت کا موجب بنتی تھی اس سے ناخواندہ مسلمانوں میں میرزائیت کا مذہبی اعتبار بڑھتا تھا، احرار نے یہ سب نقشہ پلٹ ڈالا حتیٰ کہ مسلمان خواص کو بھی جمہور کی ناراضی کے پیش نظر ان کی معاونت سے دست کش ہونا پڑا۔

۵۔ مسلمانوں نے میرزائیوں کو اپنے بیشتر اداروں سے نکال باہر کیا اور عام انتخاب میں ان کے چناؤ کی تمام راہیں مسدود ہو گئیں۔

۶۔ سب سے بڑی جیت یہ ہوئی کہ دورِ حاضر کے سب سے بڑے مسلمان مفکر علامہ اقبالؒ نے قادیانی تحریک کے مالہ وماعلیہ کا مطالعہ کر کے اس کا تجزیہ کیا۔ چنانچہ میرزائیوں کو مسلمانوں سے علیحدہ اقلیت قرار دینے کے مجوز حضرت علامہؒ ہی تھے۔ میرزائیت سے متعلق علامہؒ اقبالؒ کے افکار بلاشبہ حرفِ آخر ہیں۔

(ملاحظہ ہو علامہ اقبال کا بیان مطبوعہ سٹیٹسمین، ۱۰ جون ۱۹۳۵ء)

۷۔ مولانا ظفر علی خان اور جماعت احرار کی پیدا کردہ تحریک کے درمیانی دنوں میں جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن کے صدر شعبہ "معاشیات" پروفیسر محمد الیاس برنی نے "قادیانی مذہب" کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھی جس کی لوح پر عبارت ذیل درج ہے۔

‘‘دین وملت کی صلاح وفلاح کا دعویٰ کر کے کس کس طرح تخریب وتفرقہ کی سازش کی گئی قادیانیت کا یہ فریب اسلام کی تاریخ میں یادگار رہے گا اور انجام بھی عبرت آموز ہوگا۔’’

’’قادیانی مذہب‘‘ کی اشاعت سے نہ صرف میرزائیوں میں ہلچل مچ گئی بلکہ پڑھے لکھے لوگوں میں ان کی قلعی کھلنے لگی۔

۸۔ علامہ اقبالؒ کی ہمنوائی میں لاہور ہائی کورٹ کے ایک ریٹائرڈ جج میرزا سرظفر علی نے بھی بہ دلائل ثابت کیا کہ قومیں نبوتوں کی بنا پر معرض وجود میں آتیں اور الگ الگ شمار ہوتی ہیں۔

۹۔ میرزائیت کے کاسۂ سر پہ سب سے کاری قانونی ضرب مسٹر جی ڈی کھوسلہ سیشن جج گورداسپور کے فیصلے سے پڑی، اس فیصلہ سے میرزائی بوکھلا گئے۔ انہوں نے بعض حصوں کو محذوف کرانے کے لئے عدالتِ عالیہ سے رجوع کیا۔ غرض یہ پہلا عدالتی جائزہ تھا کہ میرزائیوں کی ’’ریاست اندر ریاست‘‘ کے چہرے سے گھونگھٹ اُٹھایا گیا اور حکومت کو بھی غالباً پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ اس کا ’’خود کاشتہ پودا‘‘ خودسر بھی ہے۔

## قادیانیت کا مسلک

احرار کو اصرار تھا کہ:

۱۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم المرسلینی کے بعد اگر کوئی شخص ظلی یا بروزی نبوت کا دعویٰ کرتا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ مسلمانوں کی سیاسی وحدت کے موجودہ زوال سے فائدہ اُٹھا کر ان کی دینی وحدت کو بھی پارہ پارہ کرتا ہے جس کے نتائج دین ودنیا دونوں کیلئے خسران کا موجب ہوں گے اور میرزائیت فی زمانہ اسی خسران کا سرچشمہ ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو اعتراف مندرجہ تبلیغ رسالت جلد ہفتم بعنوان درخواست بحضور نواب لیفٹیننٹ گورنر بہادر دام اقبالہ منجانب میرزا غلام احمد مورخہ ۲۴ فروری ۱۸۹۸ء)

نے ۱۹۱۱ء میں سرکار کی خصوصی اجازت سے کیا اور نول کشور گیس پرنٹنگ ورکس کے زیر اہتمام بڑے تزک و احتشام سے چھپوایا، اس کی جلد دوم کے صفحہ ۶۶ پر میرزا غلام احمد صاحب کے خاندان کا شجرہ نسب اور ضروری کوائف درج ہیں۔ انہی کے الفاظ میں اس کا خلاصہ ہے۔

۱۔ عطا محمد (میرزا صاحب کے دادا) اور ان کا والد گل محمد رام گڑھیہ اور کنھیا (سکھ جماعتوں) سے لڑتے رہے آخرکار عطا محمد اپنی تمام جاگیر کھو کر سردار فتح سنگھ اہلووالیا کی پناہ میں بیگووال چلا گیا جہاں بارہ سال تک امن و امان سے زندگی بسر کی۔

۲۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے عطا محمد کی وفات پر اس کے بیٹے غلام مرتضیٰ (میرزا غلام احمد کے والد) کو [illegible] بلا لیا۔ اور جدی جاگیر کا بہت بڑا حصہ لوٹا دیا۔ اس پر غلام مرتضیٰ [illegible] بھائیوں سمیت مہاراجہ کی فوج میں داخل ہوا اور کشمیر کی سرحد کے علاوہ دوسرے مقامات پر قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔

۳۔ نونہال سنگھ، شیر سنگھ اور دربار لاہور کے دور دورے میں غلام مرتضیٰ فوجی خدمت پر مامور رہا۔ ۱۸۴۱ء میں جرنیل ونطورا کے ساتھ منڈی اور کلو کی طرف بھیجا گیا پھر ۱۸۴۳ء میں ایک پیادہ فوج کا کمیدان بنا کر پشاور روانہ کیا گیا۔ ہزارہ کے "مفسدے" میں اس نے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔

۴۔ جب پنجاب کا انگریزوں سے الحاق ہو گیا تو خاندان کے دوسرے افراد کی جاگیر ضبط ہو گئی لیکن سات سو روپیہ کی پنشن غلام مرتضیٰ اور اس کے بھائیوں کو عطا کی گئی۔

۵۔ اس خاندان نے غدر ۱۸۵۷ء کے دوران میں بہت اچھی خدمات سرانجام دیں۔ غلام مرتضیٰ نے بہت سے آدمی بھرتی کئے اس کا بیٹا غلام قادر (میرزا غلام احمد کا بھائی) اس وقت جنرل نکلسن کی فوج میں تھا اس نے ۴۶ نیٹو انفنٹری (سیالکوٹ) کے باغیوں

---

حضرت سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کے خلاف۔

کو تہ تیغ کیا۔ جنرل مذکور نے غلام قادر کو ایک سند عطا کی جس میں لکھا:
"کہ ان کا خاندان قادیان ضلع گورداسپور کے تمام دوسرے خاندانوں سے زیادہ نمک حلال رہا ہے"
اپنی اس نمک حلالی کا اقرار و اعتراف خود میرزا صاحب اور ان کے جانشینوں کو رہا۔ ان کے اپنے الفاظ میں کتابوں کی پچاس الماریاں بھری پڑی تھیں جن میں انگریزوں کے قصیدے مرقوم تھے مگر سکھوں سے اپنی وفاداری کی پوری رُوداد اُسی طرح غائب کر دی جس طرح آج انگریزوں کے چلے جانے پر کاسہ لیسی کا ریکارڈ تلف کیا گیا اور تعبیر و تاویل کا دلچسپ اثاثہ فراہم کر کے اب کئی جلدوں میں تاریخ احمدیت لکھی گئی ہے۔

میرزا صاحب کے ان خاندانی حالات سے جن واقعات کی نشاندہی ہوتی ہے ان کی تاریخی تفصیلات معلوم کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ میرزا صاحب کے اب وجد نے مغلوں کی گرتی ہوئی دیوار کے زمانے میں سکھوں کا ساتھ دیا اور سکھوں کو زوال آمادہ پایا تو انگریزوں سے رشتۂ مودت استوار کیا۔ میرزا صاحب کے دادا اور پڑدادا نے رام گڑھیا اور کھنیا مسلوں سے جو لڑائیاں لڑیں وہ کسی اسلامی مقصد یا اپنے اقتدار کیلئے نہ تھیں بلکہ ایک مسل کے خلاف دوسری مسل کے حق میں تھیں، کیونکہ پنجاب کا بیشتر حصہ تاخت و تاراج ہو کر سکھوں کی بارہ مسلوں کے تصرف میں تھا۔ ان میں سے چھ مسلیں دریائے ستلج کے جنوب میں اور چھ شمال میں تھیں۔ میرزا صاحب کے بزرگ ان مسلوں کی باہمی جنگوں میں رام گڑھیا اور کھنیا مسلوں کے برخلاف اہلووالیا مسل کے حلیف تھے چنانچہ اہلووالیہ مسل کی شکست خوردگیوں کے باعث میرزا صاحب کے دادا کو قادیان چھوڑ کر سردار فتح سنگھ اہلووالیہ کی پناہ میں بیگووال جانا پڑا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اکال گڑھ کی فتح یابی کے بعد اہلووالیہ مسل کے سردار فتح سنگھ کو رام کرنے کے لئے کپورتھلہ کا قصد کیا۔ سردار مذکور کا باپ سردار بھاگ سنگھ وفات پا چکا تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے پہلے تو ماتم پرسی کی

پھر پگڑی بدل کر اس کو اپنا منہ بولا بھائی بنا لیا۔ اِس مفاہمت ہی کے نتیجہ میں آگے چل کر میرزا عطا محمد کے خاندان کی جلا وطنی ختم ہوگئی، عطا محمد خود تو فوت ہو چکا تھا لیکن اس کا بیٹا غلام مرتضیٰ مہاراجہ کی فوج میں ملازم ہوگیا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ اور سردار فتح سنگھ اہلو والیہ نے متحد ہو کر ڈسکہ فتح کیا پھر قصور پر چڑھائی کی اور خان افتخار حسین خان ممدوٹ کے مورث اعلیٰ نظام الدین خان کو شکست دے کر قبضہ کر لیا۔ اس پر مہاراجہ رنجیت سنگھ نے میرزا غلام مرتضیٰ کی خدمات سے خوش ہو کر اسے قادیان کی جاگیر کا ایک حصہ واگذار کر دیا۔

## خدمات جلیلہ

غرض سر لیپل ایچ گریفن اور کرنل میسی کی روایت کے مطابق میرزا غلام مرتضیٰ نے اپنے بھائیوں سمیت مہاراجہ رنجیت سنگھ کی ہر تاخت میں قابل قدر خدمات انجام دیں۔ ان لڑائیوں کی تفصیلات کا یہ محل نہیں، لیکن ظاہر ہے کہ کشمیر، پشاور اور ہزارہ پر سکھوں نے جتنے حملے کئے وہ مسلمانوں ہی کے خلاف تھے ان حملوں میں میرزا غلام مرتضیٰ اور اس کے بھائی سکھوں کی طرف سے سکھوں کے ہمراہ لڑتے رہے۔ اور یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اس دور میں سکھوں سے بڑھ کر مسلمانوں کے املاک و اموال اور عزت و آبرو کا کوئی دشمن نہ تھا ان کا واحد نصب العین مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلنا تھا۔

یہاں اس امر کا ذکر ضروری ہے کہ دربار لاہور نے اپنے دورِ اقتدار میں جن فوجی خدمات کو سرانجام دیا ان میں ایک بڑا کارنامہ حضرت سید احمد بریلویؒ کی شہادت کا المیہ ہے اس دربار کے جو سردار حضرت سید احمد بریلویؒ اور ان کی جماعت مجاہدین سے مختلف معرکوں میں صف آرا ہوتے ان میں جنرل ونطورا، ہری سنگھ نلوا اور مہاراجہ شیر سنگھ فرزند مہاراجہ رنجیت سنگھ پیش پیش تھے۔ میرزا کے والد اور بھائی انہی کی معیت میں لڑتے رہے۔ غور کیجیے میرزا صاحب کے ابا اور چچا نے دربار لاہور کی حمایت میں کیا کیا کارنامے سرانجام نہیں دیئے ہوں گے۔

حضرت سید احمد بریلویؒ کی شہادت کا المیہ اصل میں اعلائے کلمۂ رب العالمین اور احیائے سنت ختم المرسلین کی تحریک کے قتل کا سانحہ تھا۔

میرزا غلام احمد کے والد میرزا غلام مرتضیٰ نے جو گریفن کی روایت کے مطابق سکھوں کی فوج میں تھے لازماً حضرت سید احمد علیہ الرحمۃ اور جماعت مجاہدین کا مقابلہ کیا ہوگا، ہزارہ اور پشاور کے معرکوں میں ان کی شرکت سے اس کی تصدیق ہوتی ہے، ہوسکتا ہے کہ وہ ہری سنگھ نلوا کے ہمراہ بھی گئے ہوں، بہرحال سید صاحب پر جو بیتی اس کی المناک روداد مولانا غلام رسول مہر کی فاضلانہ تصنیف سید احمد شہید میں بہ تفصیل درج ہے اور قرین قیاس یہی ہے کہ گریفن کی روایات سے جو لف ونشر مرتب ہوتا ہے، اس کے مطابق میرزا صاحب کے والد شیر سنگھ کی ماتحتی میں حضرت سید احمد شہید اور ان کے لشکر سے ضرور لڑے ہوں گے اس ضمن میں اس کی تصدیق اس روایت سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت سید احمد کی شہادت کے بعد ۱۸۴۲ء میں میرزا صاحب کے والد کو ایک پیادہ فوج کا کمانڈر بنا کر پشاور بھیجا گیا جو کاملاً اعتماد کے بغیر ناممکن تھا۔ ان معرکوں کی سرگزشت تاریخ پنجاب مصنفہ سید محمد لطیف میں بصراحت درج ہے۔ بعض زیر نظر مباحث کے پیش نظر قریبی اور یقینی شہادت اسی تاریخ سے ماخوذ ہے۔ چونکہ میرزا غلام مرتضیٰ نے اپنی فوجی خدمات کا بیشتر حصہ شیر سنگھ کی ماتحتی میں بسر کیا تھا اس لئے شیر سنگھ کے مختصر حالات نذر قارئین ہیں۔

## راجہ شیر سنگھ

شیر سنگھ مہاراجہ رنجیت سنگھ کا دوسرا بیٹا تھا جو اپنی بھاوج مہارانی جنداں سے کش مکش کے بعد گدی پر بیٹھ گیا۔ مہارانی جنداں کے حامیوں میں راجہ گلاب سنگھ، راجہ ہیرا سنگھ اور سندھانوالیہ کے سردار تھے، مہارانی جنداں اور مہاراجہ شیر سنگھ کی فوجوں کے مابین لاہور میں گھمسان کا رن پڑا، شیر سنگھ کے فوجیوں نے دہلی دروازہ اور کی دروازہ سے لاہور قلعہ تک جو دکان یا مکان نظر پڑا لوٹ لیا۔ چھتہ بازار کو آگ لگا دی، حضوری باغ کے چاروں طرف

"ہماری فوجوں کے مظالم کا تذکرہ روح میں کپکپی پیدا کر دیتا ہے، جہاں تک لوٹ مار کا تعلق ہے ہم نادر شاہ ایرانی سے بھی بازی لے گئے ہیں"

اسی جنرل نکلسن نے میرزا غلام احمد کے والد ماجد کو سند عطا کی تھی کہ قادیان ضلع گورداسپور کے خاندانوں میں ان کا خاندان سب سے زیادہ نمک حلال رہا ہے۔

ہر پاکستانی اور ہندوستانی ، ۱۸۵۷ء کے دل خراش حوادث اور جانگدازانہ وقائع سے کماحقہ واقف ہے۔ اب تو خیر انگریز نہیں رہا اور تاریخ کا گرد و غبار بھی بسرعت تمام ڈھل گیا ہے لیکن ۱۸۵۷ء کے لرزہ خیز حالات خود انگریزوں کے عہد میں سامنے آ گئے تھے اس بارے میں بربادیٔ عامہ کی جزئیات تک محفوظ ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ۱۸۵۷ء کا خمیازہ تمام ہندوستانیوں کو بھگتنا پڑا۔ گو مسلمانوں کے دوش بدوش ہندو بھی لڑے تھے لیکن جو مصائب مسلمانوں پر ٹوٹے اس کے ماتم سے تاریخ انسانی کبھی فارغ نہ ہو گی۔ ان لاکھوں مسلمانوں کو جو بہمہ وجوہ نصاریٰ کی اطاعت کے خلاف تھے اور جن کے رگ و ریشہ میں راست باز علماء نے اپنی مساعیٔ پیہم سے جوش جہاد بھر دیا تھا وہ ایک ایک کر کے ختم کئے گئے، لارڈ رابرٹس کے نزدیک اس کام کا ایک مقصد تھا کہ:

"ان بدمعاش مسلمانوں کو بتا دیا جائے کہ خدا کے حکم سے صرف انگریز ہی ہندوستان میں حکومت کریں گے"

چنانچہ باغیوں کی اس "عبرتناک" سرکوبی پر لارنس نے اپنی والدہ کو ایک خط میں اظہار مسرت کرتے ہوئے لکھا:

"ہم پشاور سے جہلم پیدل پہنچے اور راستہ میں کچھ کام بھی کرتے چلے آئے، باغیوں سے اسلحہ چھینا، ان کو پھانسیوں پر لٹکایا اور توپ سے باندھ کر اڑا دینے کا جو طریقہ ہم نے استعمال کیا اس سے لوگوں کے دل پر ہماری ہیبت بیٹھ گئی۔ ہر چھاؤنی میں اسی پالیسی پر عمل ہو رہا ہے"

کی علامتیں تھیں"

جنرل نیل کا حکم تھا:

"فتح پور کے قصبے کو حراست میں لے کر تمام آبادی کو تہ تیغ کر دو اور سرغنوں کے سر عمارتوں پر لٹکا دو"

وہ لکھتا ہے:

"ہم پھانسی دیتے وقت عام طور پر آم کے درخت اور ہاتھی کو استعمال کرتے تھے۔ یعنی ملزم کو ہاتھی پر بٹھا کر درخت کے نیچے لے جاتے اوپر سے رسی ڈال کر ہاتھی کو ہنکار دیا جاتا ملزم لٹک کر تڑپنے لگتا اور جانکنی کے وقت انگریزی کے ہندسے 8 کی دلچسپ شکل بن کر رہ جاتا۔"

- عورتوں نے عصمت دری کے خوف سے خودکشیاں کر لیں۔
- مُردہ سپاہیوں کی لاشوں کو بھی درختوں پر لٹکا دیا گیا۔

دہلی اور لکھنؤ کے شاہی خاندانوں پر جو بیتی وہ ایک مستقل خونیں باب ہے، دہلی کا حال تو یہ تھا کہ جس شخص کے چہرے پر داڑھی نظر آتی یا کسی کے پاجامہ کا پائنچہ اُونچا معلوم ہوتا وہ تختۂ دار پر لٹکا دیا جاتا۔

اور اس سارے خونیں تماشے کا ہدایت کار کون تھا؟ بہ قول مسٹر ایڈورڈ ٹامسن "لیتھ فلڈ نکلسن" جس نے میرزا غلام احمد اور سردار سکندر حیات کے اسلاف کو نمک حلالی کی سندیں عطا کی تھیں۔ یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ احرار نے اوّل الذکر کی نبوت کے خلاف دینی محاذ قائم کیا اور موخر الذکر کی وزارت کے خلاف سیاسی محاذ، آج دونوں کی بدولت انہیں بے شمار قوتوں کا ہدف بننا پڑا حتی کہ تحقیقاتی عدالت کی سنگدلانہ رپورٹ (مصنفہ جسٹس محمد منیر) میں ان کا گوشت پوست اپنے پر لٹکا دیا گیا۔ "غدر" کے حادثوں اور سانحوں پر W. H. Fitcheit کی کتاب Tale of the great Munity سے بہتر تبصرہ ناممکن ہے، وہ ایک پادری

کو روایت سے لکھتا ہے:

"ایک دفعہ اس نے عیسائی مبلغوں کی ایک جماعت سے کہا کہ وہ غدر پر جواب مضمون لکھیں۔ لیکن ہر طالب علم نے کچھ لکھے بغیر خالی کاغذ واپس کر دیئے جس کا مطلب خاموش متفقہ اور ناقابل عفو انکار تھا۔"[1]

## ٹیپو سے ظفر تک

القصہ سلطان ٹیپو کی شہادت (۱۷۹۹ء) سے جس المیہ کا آغاز ہوا تھا وہ ایک اٹھاون برس کی مدت میں بہادر شاہ ظفر کی جلا وطنی (۱۸۵۷ء) پر ایک نئے دور میں داخل ہو گیا۔

سلطان ٹیپو کی شہادت پر بہت سی تاریخیں کہی گئیں جن میں شمشیر گم شدہ " (تلوار گم ہو گئی) الہامی ہے، آخر ۱۸۵۷ء میں قطع ید ہو گیا۔ اب مسلمان سارے ہندوستان میں تمامی طور پر مغلوب تھے اور صرف دماغوں کا قتل عمد باقی تھا۔ اس خاکستر میں جو چنگاریاں رہ گئی تھیں اور جنہیں حضرت سید احمد شہیدؒ کے باقیات الصالحات کہنا صحیح ہو گا وہ اپنے ماضی کے پشتیبان تھے۔ حضرت سید احمد کا جہاد صرف سکھوں ہی کے خلاف نہ تھا بلکہ اس کا اصل نشانہ انگریز تھے، گوالیار کے فرمانروا دولت راؤ سندھیا کے برادر نسبتی ہندو راؤ گھوٹکے کے نام سید احمد ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:

"وہ غیر جن کا وطن بہت دور ہے بادشاہ بن گئے جو تاجر سامان بیچ رہے تھے انہوں نے سلطنت قائم کر لی۔"

اور ان کے بارے میں ان کا عزم کیا تھا۔ شاہ محمود درانی والئی ہرات کے فرزند شہزادہ کامران کو لکھتے ہیں:

"پھر میں مجاہدین کو لے کر ہندوستان کی طرف متوجہ ہوں گا، مرا اصل مقصود ہندوستان

---

[1] غدر کے متعلق مندرجہ بالا حوالے "انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رُخ" سے ماخوذ ہیں۔

یہ جہاد ہے۔"

مؤرخ فن موقمن کے ایک عقیدہ تصیدت کے دعائیہ اشعار سے بھی اس امر کی وضاحت ہوتی ہے کہ حضرت سید احمد شہیدؒ کے نزدیک جہاد کی علی التواتر تلقین و ترغیب کا مقصد ہندوستان سے انگریزوں کا اخراج تھا۔

(ملاحظہ ہو جماعت مجاہدین مصنف غلام رسول مہر صفحہ ۱۱ تا ۱۶)

مولانا غلام رسول مہر کی تحقیق کے مطابق حضرت سید احمد شہیدؒ کے جہاد کا رُخ انگریزوں سے ہٹا کر سکھوں کی طرف پھیرنے والے سرسید احمد خان ہیں۔

(دیکھو سیرت سید احمد شہیدؒ صفحہ ۲۵۲ عنوان افسانہ طرازیاں)

## جہاد کا خوف

انگریزوں نے ہندوستان تو فتح کر لیا لیکن مسلمانوں کے دل و دماغ میں جہاد کا جو عقیدہ راسخ تھا وہ اس کی عالمی رورح سے غافل نہ تھے، اور اس کا تجربہ انہیں مسلمان ملکوں میں خصوصیت سے ہو رہا تھا بلکہ صلیبی جنگوں کا ایک پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے تھا۔ لارڈ جارج نے گو بہت بعد میں کہا لیکن انگریزوں کے تحت الشعور میں یہ خیال ہمیشہ جاگزیں رہا کہ قرآن ہمارے راستے کی بہت بڑی روک ہے۔

اپنی اس کھلی ہار (۱۸۵۷ء) کے بعد علماء نے پینترا بدلا اور زور دینا شروع کیا کہ ہندوستان دارالسلام سے دارالحرب ہو گیا ہے۔ اس ذہنی صف بندی کی ایک گونہ تفصیلات ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کی تصنیف "ہمارے ہندوستانی مسلمان" سے معلوم ہوتی ہیں۔ اس کتاب کے آخر میں ان علمائے کرام کے فتاویٰ بھی درج ہیں جو جسمانی امن کے بعد انگریزی حکومت کے پرستاروں اور گماشتوں کی معرفت حاصل کئے گئے ____ مثلاً شمالی ہند کے دو رام پوری اور سات لکھنوی علماء کا فتویٰ جو سید امیر حسین شاہ اسسٹنٹ کمشنر بھاگل پور کے استفسار پر جاری کیا گیا اس پر ۱۷ جولائی ۱۸۷۰ء کی تاریخ ثبت ہے "ہندوستان میں جہاد جائز ہے

یا نہیں ؟" کا جواب دیتے ہوئے ان علمائے کرام کا ارشاد ہے کہ :

"مسلمان رعایا کے پاس نہ اپنے حاکموں کے ساتھ لڑنے کی طاقت ہے نہ ان کے پاس ہتھیار ہیں، برخلاف اس کے اگر لڑائی شروع کر دی جائے تو شکست ناگزیر ہے جس سے اسلام کی عزت کو نقصان پہنچے گا۔ لہٰذا جہاد واجب نہیں۔ ضروری ہے کہ جہاد کیا جائے تو اس میں مسلمانوں کی فتح اور اسلام کی برتری کا قیاس غالب ہو اگر اس قسم کے قیاس کا امکان نہ ہو تو جہاد ناجائز ہے۔"

اسی کتاب میں ایک اور فتویٰ محمڈن سوسائٹی کلکتہ کی طرف سے مرقوم ہے جس میں جہاد کو بغاوت سے تعبیر کیا گیا اور مسلمانوں کو تلقین کی گئی ہے کہ وہ بغاوت کی صورت میں اپنے حاکموں کا ساتھ دیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جماعت مجاہدین کا قافلہ شمال مغربی سرحدوں میں سرگرم تھا اور انگریزوں نے ان پر لگاتار چڑھائیاں کر رکھی تھیں ـــــ اس جذبے کو مدھم کرنے کے لیے جمال دین ابن عبداللہ، شیخ عمر، حنفی مفتی مکہ معظمہ، احمد بن ذینی شافعی مفتی مکہ معظمہ اور حسین بن ابراہیم مالکی مفتی مکہ معظمہ سے اس مطلب کے فتوے حاصل کیے گئے کہ ہندوستان دارالسلام ہے۔

## علماء کے خلاف مقدمات

انگریزوں نے جنگ امبیلہ (سرحد) ۱۸۶۳ء کے بعد ان مجاہدین و معاونین پر ہاتھ صاف کرنا شروع کیے جو ہندوستان کو دارالحرب کہتے اور جہاد و غزا کے علمبردار تھے، ایک پٹھان غزن خان کی مخبری پر مجاہدین کے تمام مددگار پکڑے گئے اور مندرجہ تحت پانچ مقدمہ ہائے سازش کی بنا رکھی گئی۔

۱۔ مقدمہ سازش انبالہ (۱۸۶۴ء) میں گیارہ ملزم تھے، مولانا یحییٰ علی صادق پوری ان کے امیر تھے بقول راوِنشا مولانا کو "امیر الواعظین" کا خطاب حاصل تھا۔ سر ہربرٹ نے انہیں سزائے موت سناتے ہوئے فیصلہ میں لکھا۔

"مسلمانوں کی مذہبی دیوانگی جس کے لئے قرآن سے کافی سند مل سکتی ہے۔ بہت بھڑکا دی گئی ہے ـــــ اندیشہ ہے کہ عامۃ المسلمین بہت جلد باغی ہوجائیں گے جن میں ناراض مذہبی دیوانے اور تنگ نظر علماء بھی شامل ہوں گے جو حکومت سے ناجائز طور پر ناراض ہیں اور جاہل مسلمانوں پر بے حد اثر رکھتے ہیں"۔

(مسلمانان ہند۔ ہنٹر صفحہ ۱۵۱)

ڈاکٹر ہنٹر نے مزید لکھا۔

"سب سے پہلے شمالی ہندوستان کے مسلمان علماء نے حکومت کے خلاف جہاد کا فتویٰ صادر کیا اس کے بعد مسلمانان بنگال نے اسی مضمون پر ایک رسالہ جاری کیا اور شیعہ جو تعداد میں تھوڑے ہیں وہ بھی اپنے خیالات کی اشاعت سے رُک نہ سکے"۔

(مسلمانان ہند۔ صفحہ ۱۸)

## علی گڈھ کی تحریک

دوسری طرف انگریزوں نے علی گڈھ کی تحریک کو غنیمت سمجھا۔ فروری ۱۸۷۳ء میں علی گڈھ کالج کی بنیاد رکھی گئی، کالج کے بانی سر سید احمد خان (علیہ الرحمۃ) پر پیش آمدہ حالات کی سنگینی کا ایک خاص اثر تھا اور وہ مسلمانوں کو اُن کی گرتی ہوئی دیوار سے بچانا چاہتے تھے۔ چنانچہ تعلیمی، مذہبی اور اصلاحی تحریکوں کا ایک سرچشمہ پھوٹنے لگا۔ جہاں تک قرآن مجید کی جدید تفسیروں اور اسلام سے عیسائیت کے اختلافات کی فروعی بحثوں کا تعلق تھا ان کا فائدہ ارادی طور پر' نہ سہی غیر ارادی طور پر انگریزوں ہی کو پہنچا۔ کیونکہ اصل مقصد مسلمانوں کے فکر و نظر میں سوچ بچار کی تبدیلیاں لانا اور ان میں دو ایسی جماعتیں تیار کرنا تھا جو نہ صرف باہمدگر شرعی اختلافات کا شکار ہوں بلکہ ان کے الجھاؤ سے مسلمانوں کی مذہبی وحدت میں دراڑ واقع ہو۔ چنانچہ ان حصوں میں جہاں ۱۸۵۷ء کے حالات کا بلا واسطہ اثر تھا اور انگریزوں کے خلاف جذبات شدت پر تھے ایک خاص کوشش سے اصول مفاسد اور فروغ مفاسد کی بنیادیں قائم کی گئیں ـــــ

ابراہیم بن العذری عند بیقی نے ان تین جملوں میں ان مفاسد کی تعریف بیان کی ہے تاویل الجاہلین وتحریف الغافلین وانتحال المطلبین۔

سر ولیم میور یوپی کا گورنر تھا۔ اسی نے علی گڈھ کالج کی پہلی عمارت ایم اے او سکول کا سنگ بنیاد رکھا۔ اس کو مسلمانوں سے اس قدر عناد تھا کہ آج تک اسلام اور بانیٔ اسلام کے خلاف جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں سب سے بدتر کتاب اسی بد بخت کی ہے۔ اس کی کتاب کا خلاصہ اسی کے الفاظ میں یہ ہے کہ انسانیت کے دو سب سے بڑے دشمن محمدؐ کی تلوار اور محمدؐ کا قرآن ہیں (نعوذ باللہ)

(دیکھو موج کوثر مصنفہ شیخ محمد اکرام صفحہ ۱۶۳)

جن لوگوں نے حوادث کے اس زمانے میں فسخ جہاد کی تاویلوں کے علاوہ اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم میں اولی الامر کا مصداق انگریزوں کو ٹھہرایا ان میں مشہور انشا پرداز ڈپٹی نذیر احمد کا نام بھی ہے جو ایک شیوا بیان مقرر ہونے کے علاوہ مایہ ناز ادیب اور بلند پایہ مصنف بھی تھے انہوں نے قرآن مجید کے ترجمے میں انگریزوں کو پہلی دفعہ اولوالامر قرار دیا اور ان کی اطاعت کو اللہ اور رسول کی اطاعت سے متلازم، اپنے اس ترجمہ کی کاپی سر ولیم میور کو انگلستان بھجوائی تو اس کی سفارش سے "شمس العلماء" کا خطاب پایا اور اسی ترجمہ پر ایڈنبرا یونیورسٹی نے ایل ایل ڈی کی ڈگری عطا کی۔

(دیکھو داستان تاریخ اردو مصنفہ حامد حسین قادری صفحہ ۴۹۸)

پنجاب میں تاویل الجاہلین وتحریف الغافلین وانتحال المطلبین کے صحیح مظہر میرزا غلام احمد ثابت ہوئے۔ میرزا صاحب نے اپنے والد میرزا غلام مرتضیٰ کی وفات (۱۸۷۶ء) کے عرصہ بعد ۱۸۹۱ء میں مسیح اور مہدی ہونے کا دعویٰ کیا۔ میرزا صاحب پہلے ڈپٹی کمشنر سیالکوٹ کی عدالت میں اہلکار تھے۔ وہاں سے الگ ہو کر تنسیخ جہاد کی تلقین وترغیب کا دھندا شروع کیا اور انگریزوں کی غلامی کا مذہبی جواز پیدا کرنے لگے۔ اس جواز کی بنیاد الہامات پر رکھی

اور وہ تمام خصوصیتیں جو اسلامی اعتقادات کا طرۂ امتیاز تھیں اپنی ذات میں مرتکز کرنا شروع کیں۔ ان کے ان عجیب وغریب دعاوی اور افغانی علاقے میں جہاد وغزا کا زمانہ ایک ہی ہے۔
نتیجہ یہ نکلا کہ اُدھر دہلی سے کلکتہ تک کا علاقہ تو دیوبند اور علی گڈھ کے ذہنی تصادمات میں مبتلا تھا۔
دہلی سے اٹک ادھر تک کے علاقہ میں ایک نیا مسئلہ پیدا ہو گیا ــــ ظلی اور بروزی نبوت۔
علماء ومشائخ نے "جہاد" کے ساتھ "نبوت" جاتے دیکھی تو اس فتنے کی سرکوبی میں لگ گئے۔
جس سے انگریزی حکومت کو فوری فائدہ یہ پہنچا کہ اسلام کا جو خطرہ اسے درپیش تھا وہ اس مسئلہ کی نذر ہو گیا۔

میرزا صاحب نے نبوت سے پہلے اور نبوت کے بعد بھی عیسائی مشنریوں سے مناظرے کئے، بعض ماڈرن لوگوں نے ان مناظروں کو میرزا صاحب کی اسلامی خدمات پر محمول کیا اور غیر شعوری طور پر اس غلط فہمی کا شکار ہو گئے کہ میرزا صاحب کی نبوت میں انگریزی حکومت کا بالواسطہ یا بلاواسطہ کوئی ہاتھ نہیں۔ حالانکہ اس بارے میں ایک بات بالکل صاف تھی کہ جو انگریز اس کوشش میں تھے کہ محمدؐ اور قرآن کو مسلمانوں کے سینے سے خارج کر دیں وہ کسی ایسے آدمی کو کیوں کر برداشت کر سکتے تھے جو نبوت کا مدعی ہو، اسلام کی تجدید چاہتا ہو اور احیائے دین کا داعی بنے پھر ایسے صوبے میں جو جماعت مجاہدین کی پناہ گاہوں کے دہانے پر واقع تھا اور جس کے سرحدی صوبے میں لڑائیوں یا جھڑپوں کا غیر مختتم سلسلہ جاری تھا۔
میرزا صاحب نے عیسائی مشنریوں سے جو مجادلے کئے ملکہ وکٹوریہ کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ یہ مناظرے یا مجادلے صرف اس لئے کرتا ہوں کہ:
"تنسیخ جہاد کے متعلق میں نے جو آن تھک مساعی سرانجام دی ہیں اور برطانیہ کی وفاداری کا جذبہ پیدا کرنے کے لئے مسلمانوں کو جس تسلسل سے رام کیا ہے اس کے پیش نظر انہیں یہ شبہ نہ رہے کہ سرکار کی طرف سے اس کام پہ مامور ہوں۔ مشنریوں سے مناظرہ کرتا ہوں تو مسلمانوں میں تنسیخ جہاد کا اعتبار پیدا ہوتا ہے" ؎

# اپنی کہانی اپنی زبانی

اس طویل پس منظر کے بعد میرزائیت کی حقیقی غایت خود بخود ابھر آتی ہے۔ اب ذرا یہ کہانی کسی دوسرے کی زبانی نہیں بلکہ خود مسیح موعود اور مہدی موعود کی "زبان الہام ترجمان" سے سماعت فرمایئے۔

۱۔ "ہمارا جاں نثار خاندان سرکار دولت مدار کا خود کاشتہ پودا ہے، ہم نے سرکار انگریزی کی راہ میں اپنا خون بہانے اور جان دینے سے کبھی دریغ نہیں کیا" (لیکن اللہ کی راہ میں جہاد حرام ہے۔ مؤلف)

(تلخیص از درخواست بحضور نواب لیفٹیننٹ گورنر بہادر منجانب خاکسار غلام احمد ۲۴ فروری ۱۸۹۸ء مندرجہ تبلیغ رسالت جلد ہفتم مولفہ میر قاسم علی صاحب)

۲۔ "غرض یہ ایک ایسی جماعت ہے جو سرکار انگریزی کی نمک پروردہ، نیک نامی حاصل کردہ اور مورد مراحم گورنمنٹ ہے۔"

(درخواست مذکور)

۳۔ "مسیح موعود فرماتے ہیں میں مہدی ہوں اور برطانوی حکومت میری تلوار! پھر ہمیں احمدیوں کی فتح بغداد سے کیوں خوشی نہ ہو؟ عراق، عرب ہو یا شام ہو ہم ہر جگہ اپنی تلوار کی چمک دیکھنا چاہتے ہیں۔"

(اخبار الفضل جلد ۶ نمبر ۴۲ مورخہ ۷ دسمبر ۱۹۱۸ء)

۵۔ بعض احمق سوال کیا کرتے ہیں کہ اس گورنمنٹ سے جہاد کرنا درست ہے یا نہیں؟ سو یاد رہے کہ ان کا سوال نہایت حماقت کا ہے کیونکہ جس کے احسانات کا شکر کرنا عین فرض اور واجب ہے اس سے جہاد کیسا؟ میں سچ کہتا ہوں کہ محسن کی بدخواہی ایک بدکار اور حرامی آدمی کا کام ہے۔"

(شہادت القرآن مصنفہ میرزا غلام احمد کا تمتہ منقول از "الفضل" جلد ۲۷ مورخہ ۱۲ ستمبر ۱۹۳۹ء)

۶- "ہمارے سر پر سلطنت برطانیہ کے بہت احسان ہیں، وہ مسلمان سخت جاہل، سخت نادان اور سخت نالائق ہے جو اس گورنمنٹ سے کینہ رکھے اگر ہم اس کا شکر ادا نہ کریں تو پھر خدا تعالیٰ کے بھی ناشکر گذار ہوں گے۔ اس سے زیادہ بے ایمان شخص کون ہو سکتا ہے کہ خدا تعالیٰ کا مسیح تو کہتا ہے کہ ہر مسلمان کو انگریزوں کی کامیابی کے لئے دعا کرنی چاہیئے اور یہ کہتا ہے کہ دُعا کی کیا ضرورت ہے، انگریزوں کو شکست ہو تو زیادہ بہتر ہے"۔

(الفضل مورخہ ۵ جون ۱۹۴۰ء میاں محمود احمد کا خطبہ)

۷- "حضرت مسیح موعود نے اپنی پاک تعلیم میں گورنمنٹ عالیہ کی اطاعت اور وفاداری کو جزو مذہب قرار دے کر ہمیں ان منافق طبع مسلمانوں سے علیحدہ کر دیا جو ابھی تک اس انتظار میں ہیں کہ خونی مہدی ایک جرار لشکر لے کر آبدار تلواروں اور سیاہ سرخ پرچموں کے ساتھ کہیں ظاہر ہوگا اور سب عیسائی سلطنتوں کو مٹا کر ان نام کے مسلمانوں کو حکمران بنا دیگا"۔

(الفضل جلد ۴ نمبر ۸۶ مورخہ یکم مئی ۱۹۱۷ء)

۸- "میں یقین رکھتا ہوں کہ جیسے جیسے میرے مرید بڑھیں گے ویسے ویسے مسئلہ جہاد کے معتقد کم ہوتے جائیں گے کیونکہ مجھ کو مسیح اور مہدی مان لینا ہی مسئلہ جہاد کا انکار ہے"۔

(اشتہار میرزا صاحب مندرجہ تبلیغ رسالت جلد ہفتم)

۹- "میں سولہ برس سے برابر اپنی تالیفات میں اس بات پر زور دے رہا ہوں کہ مسلمانان ہند پر اطاعت گورنمنٹ برطانیہ فرض ہے اور جہاد حرام ہے"۔

(اشتہار مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۸۹۴ء مندرجہ تبلیغ رسالت جلد سوم صفحہ ۲۰۰)

۱۰- "میں نے ۲۲ برس سے اپنے ذمے یہ فرض کر رکھا ہے کہ وہ تمام کتابیں جن میں جہاد کی مخالفت ہو اسلامی ملکوں میں ضرور بھیج دیا کروں گا"۔

(تبلیغ رسالت جلد دہم صفحہ ۲۶)

۱۱- "میری عمر کا اکثر حصہ اس سلطنت انگریزی کی تائید اور حمایت میں گذرا ہے اور

میں نے ممانعت جہاد اور انگریزی اطاعت کے بارے میں اس قدر کتابیں لکھی ہیں اور اشتہارات شائع کئے ہیں کہ اگر وہ رسائل اور کتابیں اکٹھی کی جائیں تو پچاس الماریاں ان سے بھر سکتی ہیں۔ میں نے ایسی کتابوں کو تمام ممالک عرب اور مصر اور شام اور کابل اور روم تک پہنچا دیا ہے میری ہمیشہ کوشش رہی ہے کہ مسلمان اس سلطنت کے سچے خیر خواہ ہو جائیں اور مہدی خونی اور مسیح خونی کی بے اصل روایتیں اور جہاد کے جوش دلانے والے مسائل جو احمقوں کے دلوں کو خراب کرتے ہیں ان کے دلوں سے معدوم ہو جائیں۔ پھر کیونکر ممکن تھا کہ میں اس سلطنت کا بدخواہ ہوتا یا کوئی ناجائز باغیانہ منصوبے اپنی جماعت میں پھیلاتا جب کہ میں بیس برس تک یہی تعلیم اطاعت گورنمنٹ انگریزی کی دیتا رہا۔ اور اپنے مریدوں میں یہی ہدایتیں جاری کرتا رہا تو کیونکر ممکن تھا کہ ان تمام ہدایتوں کے برخلاف کسی بغاوت کے منصوبے کی میں تعلیم کروں حالانکہ میں جانتا ہوں کہ خدا تعالیٰ نے اپنے خاص فضل سے میری اور میری جماعت کی پناہ اس سلطنت کو بنا دیا ہے۔ یہ امن جو اس سلطنت کے زیر سایہ ہمیں حاصل ہے نہ یہ امن مکہ معظمہ میں مل سکتا ہے نہ مدینہ میں اور نہ سلطنت روم کے پایہ تخت قسطنطنیہ میں۔ پھر میں خود اپنے آرام کا دشمن بنوں؟ اگر اس سلطنت کے بارے میں کوئی باغیانہ منصوبہ دل میں مخفی رکھوں اور جو لوگ مسلمانوں میں سے ایسے بدخیال جہاد اور بغاوت کے دلوں میں مخفی رکھتے ہیں میں ان کو سخت نادان، بدقسمت اور ظالم سمجھتا ہوں کیونکہ ہم اس بات کے گواہ ہیں کہ اسلام کی دوبارہ زندگی انگریزی سلطنت کے امن بخش سایہ سے پیدا ہوئی ہے، تم چاہو دل میں مجھے کچھ کہو، گالیاں نکالو یا پہلے کی طرح کافر کا فتویٰ لکھو مگر میرا اصول یہی ہے کہ ایسی سلطنت سے دل میں بغاوت کے خیالات رکھنا یا ایسے خیال جن سے بغاوت کا احتمال ہو سکے سخت بدذاتی اور خدا تعالیٰ کا گناہ ہے۔"

(منقول تریاق القلوب مصنفہ مرزا غلام احمد مطبوعہ بک ڈپو قادیان ۱۹۲۴ء صفحہ ۲۸-۲۷)

۱۲۔ "میں نے قرین مصلحت سمجھ کر ممانعت جہاد کو عام ملکوں میں پھیلانے کے لیئے

عربی اور فارسی کتابیں تالیف کیں اور وہ تمام کتابیں عرب، شام، روم، مصر اور بغداد اور افغانستان میں شائع کی گئیں میں یقین کرتا ہوں کہ کسی نہ کسی وقت ان کا اثر ہوگا۔"

(غلام احمد از تبلیغ رسالت جلد ۸ صفحہ ۶۲)

۱۳۔ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو نام تھے، ایک محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جو جلالی تھا دوسرا احمد جو جمالی تھا چونکہ فرقہ احمدیہ نام رکھنے میں اصل غرض اس امر کو ظاہر کرنا ہے کہ یہ زمانہ جہاد اور خونریزی کا نہیں اس لئے احمدیہ نام اختیار کیا گیا۔"

(تلخیص از "سلسلہ احمدیہ کے مختصر حالات اور عقائد" از ریویو آف ریلیجنز۔ بحوالہ افسر مردم شماری بمبئی صفحہ ۱۵۱ مئی ۱۹۰۶ء)

۱۴۔ "مجھے تین باتوں نے گورنمنٹ انگریزی کی خیر خواہی میں اوّل درجہ پر بنا دیا ہے۔

(۱) والد مرحوم کے اثر نے۔
(۲) اس گورنمنٹ عالیہ کے احسانوں نے
(۳) خدا تعالیٰ کے الہام نے۔

(تریاق القلوب صفحہ ۳۱۰ - ۳۰۹)

۱۵۔ "میرے پانچ اصول ہیں، جن میں دو حرمت جہاد اور اطاعت برطانیہ بھی ہیں۔

(تلخیص از تبلیغ رسالت صفحہ ۱۰۷)

۱۶۔ "یہ عاجز گورنمنٹ کے اس قدیم خاندان میں سے ہے جس کی خیر خواہی کا گورنمنٹ کے عالی مرتبت حکام نے اعتراف کیا اور اپنی چٹھیوں سے گواہی دی ہے ــــــ مسلمانوں کا فرض ہے کہ گورنمنٹ محسنہ کے ناشکر گزار نہ بنیں اور نمک حرامی سے خدا کے گنہگار نہ ٹھہریں کیونکہ یہ گورنمنٹ ہمارے مال و خون کی محافظ ہے۔"

۱۷۔ "مجھے عیسائی رسالہ "نور افشاں" میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف توہین آمیز الفاظ پڑھ کر اندیشہ ہوا مبادا مسلمانوں کے دلوں پر جو ایک جوش رکھنے والی قوم ہے ان کلمات کا

ہے ہمارے فوائد ایک ہو گئے ہیں اگر خدا نخواستہ اس کو کوئی نقصان پہنچا تو اس صدمہ سے ہم بھی محفوظ نہیں رہ سکتے"

(تبلیغ قادیان کا اعلان مندرجہ الفضل ۲۷ جولائی ۱۹۱۸ء)

میرزا صاحب کی ایک دوسری درخواست بحضور گورنر جنرل بہادر کمشنر ہند مجریہ یکم جنوری ۱۸۹۶ء "تبلیغ رسالت" میں درج ہے۔ میرزا صاحب نے اس درخواست میں اپنے کاسہ لیسانہ خیالات کا اعادہ کیا اور اُن لوگوں کا ایک خانہ دار نقشہ دیا ہے جو حکومت کے غیر وفادار ہیں اور نماز جمعہ صرف اس لئے نہیں پڑھتے کہ یہاں کوئی خلیفہ موجود نہیں۔ ہندوستان ان کے نزدیک دارالحرب ہے۔

ان ارشادات کی تائید و تکمیل کے لئے میرزا صاحب کا طرز مخاطبت یہ ہے کہ:

۱۔ ہم رسول اور نبی ہیں۔ (اخبار بدر ۵ مارچ ۱۸۹۸ء)

۲۔ سچا خدا وہی ہے جس نے قادیان میں اپنا رسول بھیجا۔

(دافع البلاء صفحہ ۱۱)

۳۔ خدا نے اس بات کے ثابت کرنے کے لئے کہ میں اس کی طرف سے ہوں مجھے اس قدر نشان دکھلائے ہیں کہ اگر وہ ہزار نبیوں پر بھی تقسیم کئے جائیں تو ان سے ان کی نبوت بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۳۱۷)

۴۔ جو وحی و نبوت کا جام ہر نبی کو ملا وہ مجھے بھی ملا ہے۔ (نزول المسیح صفحہ ۹۹)

اور جو ان کی نبوت پر ایمان نہیں لاتے ان کے حق میں ارشاد ہوتا ہے۔

۱۔ کُل مسلمانوں نے مجھے قبول کر لیا ہے اور میری دعوت کی تصدیق کی ہے مگر کنجریوں اور بدکار عورتوں کی اولاد نے مجھے نہیں مانا۔ (آئینہ کمالات اسلام صفحہ ۵۴۷)

۲۔ جو شخص میرا مخالف ہے وہ عیسائی، یہودی، مشرک اور جہنمی ہے۔

(تبلیغ رسالت جلد ۹ صفحہ ۲۷)

۳۔ جو شخص ہماری فتح کا قائل نہیں ہوگا تو صاف سمجھا جائے گا کہ اس کو والدالحرام بننے کا شوق ہے، حرام زادوں کی یہی نشانی ہے۔ (انوارالسلام صفحہ ۳۰)

۴۔ ہمارے دشمن بیابانوں کے خنزیر ہوگئے اور ان کی عورتیں کتیوں سے بھی بڑھ گئیں۔ (درثمین عربی صفحہ ۲۴۹)

۵۔ کُل مسلمان جو حضرت مسیح موعود کی بیعت میں شامل نہیں ہوتے خواہ انہوں نے حضرت مسیح موعود کا نام بھی نہیں سُنا وہ کافر ہیں۔ (آئینہ صداقت ۳۵)

## عام مسلمانوں سے سلوک

۱۔ "حضرت مسیح موعود نے سختی سے تاکید فرمائی ہے کہ کسی احمدی کو غیر احمدی کے پیچھے نماز نہیں پڑھنی چاہیئے۔ جتنی دفعہ بھی پوچھو گے اتنی دفعہ ہی میں یہی جواب دوں گا کہ غیر احمدی کے پیچھے نماز پڑھنی جائز نہیں جائز نہیں جائز نہیں"۔

(انوار خلافت صفحہ ۸۹ از میرزا محمود احمد)

۲۔ "ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم غیر احمدیوں کو مسلمان نہ سمجھیں ان کے پیچھے نماز نہ پڑھیں کیونکہ ہمارے نزدیک وہ خدا تعالیٰ کے ایک نبی کے منکر ہیں"۔ (انوار خلافت ۹۰)

۳۔ "اگر کوئی غیر احمدی کا چھوٹا بچہ مر جائے تو اس کا جنازہ کیوں نہ پڑھا جائے وہ تو مسیح موعود کا منکر نہیں؟ میں یہ سوال کرنے والے سے پوچھتا ہوں کہ اگر یہ بات درست ہے تو پھر ہندوؤں اور عیسائیوں کے بچوں کا جنازہ کیوں نہیں پڑھنا چاہیئے"۔

(انوار خلافت ۹۳)

۴۔ حضرت مسیح موعود نے اس احمدی پر سخت ناراضگی کا اظہار کیا ہے جو اپنی لڑکی غیر احمدی کو دے۔ آپ سے ایک شخص نے بار بار پوچھا اور کئی قسم کی مجبوریوں کو پیش کیا لیکن آپ نے اس کو یہی فرمایا کہ لڑکی کو بٹھائے رکھو لیکن غیر احمدیوں میں نہ دو آپ کی وفات کے بعد اس نے غیر احمدیوں کو لڑکی دے دی تو حضرت خلیفہ اول نے اس کو احمدیوں کی امامت سے

۱۲۔ قادیان وہ مقام ہے جس کو خدا تعالیٰ نے تمام دنیا کے لئے ناف کے طور پر بنایا ہے اور اس کو تمام جہان کے لئے اُم قرار دیا ہے کہ ہر ایک فیض دنیا کو اس مقام مقدس سے حاصل ہو سکتا ہے۔ (الفضل ۳ جنوری ۱۹۲۵ء)

۱۳۔ ہم ان لوگوں سے متفق نہیں جو کہتے ہیں کہ کسی صورت میں بھی حرمین پر حملہ نہیں کیا جا سکتا۔ مدینہ پر بھی چڑھائی ہو سکتی ہے۔ (الفضل ۲۱ ستمبر ۱۹۳۵ء)

۱۴۔ یہاں قادیان میں مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ والی برکات نازل ہوتی ہیں۔ قادیان کا سالانہ جلسہ ظلی حج ہے۔ یہ نفل اب فرض بن گیا ہے۔ (الفضل ۱۱ ستمبر ۱۹۳۲ء)

مرزا صاحب کے یہ عجوبے انیسویں صدی کی آخری دہائی یعنی ۱۸۹۰ء سے خوف اور خون کی وجہ سے سہہ لئے گئے اور بیسویں صدی کی پہلی دو دہائیوں میں علماء کے تبلیغی محاسبہ تک محدود رہے لیکن ہندوستان کی کاملاً بیداری اور مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے بعد ان کا احتساب ناگزیر ہو گیا۔ مسلمانوں نے مزاحمت شروع کی۔ احرار نے اپنی طبعی اُفتاد کے باعث مزاحمت کے فرائض اپنے ذمے لے لئے تو یہ ان سیاسی اور دینی مضرات کا قدرتی نتیجہ تھا۔ جن دینی و سیاسی خصوصیات کا مظہر احرار تھے۔ احرار اگر مزاحمت نہ کرتے تو ایک سانحہ ہوتا۔ احرار نے مزاحمت کر کے ایک ایسی جماعت یا اُمت کو زخم چاٹنے پر مجبور کر دیا جس کا وجود علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں نہ صرف مسلمانوں کی دینی وحدت کے لئے خطرے کا موجب تھا بلکہ اپنے اندر یہودیت کے وظائف کی خصوصیتیں رکھتا تھا۔ مرزا غلام احمد کی نبوت کا وظیفہ ہندوستان کی سیاسی غلامی کے حق میں الہامی بنیادیں فراہم کرنا تھا۔

فسادات پنجاب (۱۹۵۳ء) کی تحقیقاتی عدالت نے اس "قضیۂ نامرضیہ" کو عجیب و غریب حالات میں چھیڑا اور عجیب و غریب نتائج سے سمیٹا۔ جن اطلاعات پر یہ عدالتی رپورٹ لکھی گئی ان کے مطالعہ سے دو باتیں صاف طور پر مترشح ہوتی ہیں۔

اولاً: جماعتوں میں احرار سب سے زیادہ گردن زدنی قرار دیئے گئے۔

# مرزائیت

## پاکستان کے بعد

احرار کے نزدیک لیگ کا موقف ہندوستانی مسلمانوں کے قومی مسئلے کا سیاسی حل نہ تھا لیکن اس کی مخالفت مذہب کے واسطے سے کرتے تھے۔ اس کے برعکس قادیانی قیام پاکستان کو اپنے مذہب کی موت سمجھتے لیکن سیاستہً گومگو کی حالت میں تھے۔ میرزا محمود احمد کی بعض تحریروں سے پاکستان کی مخالفت کا نمایاں سراغ ملتا ہے اور منیر انکوائری رپورٹ (صفحہ ۱۹۶) نے بھی اس کی نشاندہی کی ہے۔

مثلاً میرزا البشیر الدین محمود نے ایک تقریر میں فرمایا اور یہ تقریر ان کے سرکاری ترجمان روزنامہ "الفضل" میں چھپ چکی ہے کہ موجودہ ملکی تقسیم غلط ہوئی ہے، وہ تقسیم ختم کرا سنے اور دونوں ملکوں کے باہمی افتراق دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔ اس عارضی تقسیم کو کسی نہ کسی طرح ختم کیا ہی جائے گا اور ہندوستان و پاکستان کو پھر سے اکھنڈ ہندوستان بنایا جائے گا۔

احرار چونکہ مسلمان عوام سے مخاطب تھے اور ان کا نقطۂ نگاہ مشروط طور پر کانگرس کا نقطۂ نگاہ تھا۔ اس لئے ان کی مخالفت کا چرچا ہو گیا اور میرزا محمود احمد کی مخالفت کا چرچا

یا شہرت اس لئے نہ ہو سکی کہ وہ نہ تو لیگ کے مقابلہ میں صف آرا تھے اور نہ ان کا رویّہ مزاحمانہ تھا۔ لیکن وہ جس خلافت کو قائم کئے ہوئے تھے اس کی بقا یا استحکام کے لئے قیامِ پاکستان سے خائف تھے۔ انہیں جائز طور پر یہ اندیشہ تھا کہ پاکستان میں "خود کاشتہ پودا" پروان نہیں چڑھے گا اور تحقیقاتی رپورٹ کے الفاظ میں اعتزال و تفریق کی حوصلہ افزائی نہیں ہوگی۔

چنانچہ احرار کے لئے انگریزوں کا نکل جانا سالہا سال کی جدو جہد کا خوش آئند نتیجہ تھا اور قادیانوں کے لئے انگریزوں کا نکالا جانا ہوشربا سانحہ ـــــ لیکن دونو کو اپنے افکار و کوائف کے باعث ایک ایسی منفی صورت حالات کا سامنا کرنا پڑا جس کا صحیح آئینہ فسادات پنجاب (۱۹۵۳ء) کی عدالتی رپورٹ ہے۔

جسٹس محمد منیر اور جسٹس محمد رستم کیانی اس رپورٹ کے مرتبین تھے۔ گورنر پنجاب کے آرڈیننس نمبر ۳ (۱۹۵۲ء) کی ہدایات و شرائط کے مطابق یہ تحقیقاتی کمیٹی قائم کی گئی۔ فاضل جج صاحبان کی تجویز کی ہوئی بعض ترمیموں کے بعد فسادات پنجاب تحقیقات عامہ (۱۹۵۲ء) ایکٹ بن گیا اور یکم جولائی ۱۹۵۳ء کو تحقیقات کا آغاز ہوا۔ کل ۱۱۷ اجلاس منعقد کئے گئے جن میں ۱۱۲ اجلاس شہادتوں کے لئے مخصوص رہے۔ ۲۸ فروری ۱۹۵۴ء کو کمیشن نے اپنا کام ختم کر دیا۔ فاضل ججوں نے ۳۸۷ صفحات پر مشتمل انگریزی میں ایک رپورٹ لکھی جس کا اُردو ترجمہ سرکاری اہتمام میں کرایا گیا اور محکمہ تعلقات عامہ (پنجاب) نے شائع کیا اس ترجمہ کے ۴۳۵ صفحات ہیں۔



جتنی جماعتیں اس معرکے میں ماخوذ تھیں ان میں سے لیگ اور احرار کے سوا تقریباً سب نے اپنے جوابی تبصرے کتابی شکل میں شائع کئے۔ لیگ نے اس سارے قضیئے کو خواجہ ناظم الدین اور میاں محمد ممتاز دولتانہ کی ذمہ داری پر محمول کیا اور وہ دونو وزارتوں سے سبکدوشی کے بعد لیگ کی مرکزی اور صوبائی صدارتوں سے بھی علیحدہ ہو چکے تھے۔

احرار کی جوابی راہ میں بظاہر تین رکاوٹیں تھیں۔

اولاً: مجلسِ احرار کو خلاف قانون تنظیم قرار دیا گیا۔

ثانیاً: وہ قلم کے نہیں زبان کے دھنی تھے یعنی تحریر کے بجائے تقریر کے آدمی تھے۔

ثالثاً: رپورٹ میں جس بڑے انداز سے اُن کا ذکر کیا گیا شاید اس کے پیشِ نظر وہ اپنے سر صفائی کی تہمت لینے کو تیار نہ تھے۔

بہر حال رپورٹ کا غالب حصہ جانبدارانہ آلائشوں کا حامل ہے اور کسی لحاظ سے بھی اس رپورٹ کو کسی جج کا تجزیہ نہیں کہا جا سکتا۔ اگرچہ اس کے مصنف جج تھے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال خلف الرشید علامہ اقبال نے اپنی ایک کتاب کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ یہ ایک ایسی دستاویز ہے جو اسلام کے خلاف خود مسلمان ججوں کے قلم سے نکلی ہے اس کی اشاعت روک لی جائے بلکہ اس کتاب کو ضبط ہونا چاہیئے۔" دنیائے اسلام آج تک نفس اسلام کے خلاف ایسی دستاویز شائع نہیں ہوئی۔ یہ سب سے بڑی تحریر ہے جس میں دو مسلمان ججوں کے ہاتھ سے مسلمانوں کی رسوائی کا سامان کیا گیا ہے۔ امتدادِ زمانہ کے ساتھ یہ رپورٹ مرچکی ہے۔ جسٹس کیانی نے راقم سے کہا تھا کہ وہ اس کتاب کی اشاعت سے پریشان و پشیمان ہیں اور جو حصہ اس میں اسلام کے خلاف ہے وہ جسٹس منیر کے قلم سے ہے۔

تمام خرابی ان واقعات کی بوقلمونی میں ہے جنہیں رپورٹ میں زیر بحث لایا گیا ہے مولانا مرتضیٰ احمد میکش نے اس بوقلمونی ہی کو ملحوظ رکھتے ہوئے محاسبہ (جوابی تبصرہ) کا سر آغاز اس طرح کیا ہے کہ:

"رپورٹ کی مثال اس ہاتھی کی ہے جس کے مختلف اعضاء کو چھ اندھوں نے اپنے ہاتھوں سے ٹٹولا اور اپنی حس لامسہ کی مدد سے ہاتھی کے متعلق ہر ایک نے اپنا جدا جدا مخصوص تصور قائم کر لیا۔ ایک نے کہا ہاتھی ایسا تھا جیسے عمارت کا ستون۔ دوسرا بولا

ایک بہت بڑا اچھاج۔ تیسرے نے کہا موٹا سا اژدھا۔ چوتھے نے کہا کہ ہاتھ بھر کی موٹی رسی۔ پانچویں نے کہا ناہموار سا چبوترہ۔ چھٹے نے ارشاد فرمایا وہ ایک دیوار سی تھی اور بس۔ اس رپورٹ نے بعینہٖ اسی قسم کی کیفیت عامۃ الناس میں پیدا کی ہے اور ہر شخص اپنی سمجھ کے مطابق اس کے متعلق اپنا خیال اور تصور قائم کر چکا ہے یا کر رہا ہے۔

اس خرابی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ تحقیقات کا دائرہ غیر ضروری حد تک پھیلا دیا گیا۔ خود حکومت کا اس بارے میں کوئی نقطۂ نگاہ نہ تھا۔ محولہ اختیارات کی دفعہ ۵ کی ذیلی دفعہ ۵ میں یہ صراحت درج تھا کہ عدالت مجموعہ ضابطۂ فوجداری کی شرائط وقیود کی پابند نہ ہوگی۔ بنابریں عدالت نے قانون شہادت کی پابندی سے مختلف راستہ اختیار کیا۔ چنانچہ رپورٹ کی ابتدا میں اس کا ذکر موجود ہے لیکن عدالت نے اپنے اجلاسوں میں جو طرزِ عمل اختیار کیا وہ اپنے متعلق عدالتی لیکن ماخوذین کے متعلق غیر عدالتی تھا۔

## خفی اور جلی پہلو

بہرحال رپورٹ کے بہت سے خفی اور جلی پہلو ہیں:

۱۔ اس رپورٹ کو علما کے برخلاف ایک اجتماعی مقدمہ COLLECTIVE TRIAL کی خصوصیت حاصل ہے۔ ساری اسلامی تاریخ میں اس نوعیت کا کوئی مقدمہ نہیں۔ میاں فضل حسین نے ۱۹۳۶ء کے اواخر میں احرار سے قادیانی محاذ چھیننا چاہا تو مولانا ظفر علی خاں کو ڈلہوزی بلا کر ترغیب دی کہ وہ عدالت عالیہ میں مقدمہ دائر کر کے قادیانی جماعت کے نامسلمان ہونے کا فیصلہ حاصل کریں۔ مولانا مقدمہ دائر کرنے کے لئے تیار ہو گئے لیکن اس سازباز کی اطلاع میاں صاحب مرحوم کے ایک معتمد نے راتوں رات چودھری افضل حق کو پہنچا دی۔ جس صبح "زمیندار" میں اس تجویز کا اعلان کیا گیا اسی صبح چودھری صاحب نے اپنے اخبار "مجاہد" میں بھانڈا پھوڑ دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس تجویز پر پانی پھر گیا۔

گو اس مقدمہ کی تجویز اور اس رپورٹ کی نوعیت میں لفظاً و معناً فرق ہے لیکن

اساس و بنیاد دونوں کی یکساں ہے۔ ایک گروہ جو ملا کی رجعت خواہی سے بیزار ہے اس اجتماعی مقدمہ کو علماء کی شکست فاش سمجھ کر خوش ہوتا رہا۔ دوسرا گروہ جو انکوائری کے ماخوذین پر مشتمل تھا اپنے اپنے معتوبین یا ملزمین کی رسوائی پر خوش تھا۔ بعض تحریک اور اس کے نتائج کی ذمہ داری سے بچنا چاہتے تھے۔ تیسرا گروہ فسادات کے اسباب و علل کی کنہ تک پہنچنے کو تو درست سمجھتا تھا لیکن بعض علمی، عملی، شرعی اور نظری مباحث کے لئے عدالت کی عاجلانہ فضا کو ناموزوں خیال کرتا تھا۔ چوتھا گروہ ان عناصر پر مشتمل تھا جن کے جذبات کا خلاصہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اس زمانہ میں مشرقی پاکستان کے حالات کی تجزیاتی رپورٹ میں بہ الفاظ ذیل پیش کیا تھا۔

"اسلام کے خلاف وسیع پروپیگنڈے کی پشت پر ہندو اور کمیونسٹ دماغ ہیں جو اسلام کو ناکام مذہب ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ اس کی ساری تاریخ کو گھناؤنی اور قابلِ نفرت شکل میں پیش کرتے رہے ہیں۔ اس کے نظامِ زندگی کو ناکارہ اور نقصان رساں اور فرسودہ و جاہلانہ نظریات کا مجموعہ بتاتے رہے ہیں اور اس کام میں ان کو سب سے زیادہ مدد منیر رپورٹ سے ملی ہے جس کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس وقت دنیا میں کوئی ایسی دوسری دستاویز موجود نہیں ہے جو مشرق و مغرب میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اس قدر غلط فہمیاں پھیلانے کی موجب ثابت ہوئی ہو۔ (صفحہ ۱۷۱، ۱۸)

۲۔ تمام رپورٹ میں ضروری شہادت کا مدار زیادہ تر سی آئی ڈی کی رپورٹوں پر ہے اور ان کے بارے میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ سی آئی ڈی سے زیادہ ناکارہ عنصر ملک بھر میں شاید ہی ہو۔ ان رپورٹوں کا لب و لہجہ غایت درجہ معاندانہ بلکہ بڑی حد تک احمقانہ تھا۔ بسا اوقات خیال ہوتا ہے کہ سی آئی ڈی کے حکام قادیانی اُمت کے ساتھ مل کر اپنی رپورٹیں لکھتے لکھاتے اور تجزیہ و تبصرہ کرتے تھے۔

## احرار کے خلاف محاذ

تمام رپورٹ کے بالاستیعاب مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ :

(الف) سی آئی ڈی نے احرار کو شروع ہی سے ہدف مطاعن بنائے رکھا۔ اس نے اصل نزاع کو سمجھنے کی بجائے صرف احرار کو ملزم گردانے کی کوشش کی، اس کا طریق فکر ایک ایسے ناول نگار کا ہے جو ایک خاص قسم کی ذہنی فضا تخلیق کرکے اچھے بُرے کردار پیدا کرتا اور اپنے زورِ بیان کی نمائش کرتا ہے۔ احرار کے باب میں سی آئی ڈی کا قلم جراح کا نشتر نہیں حلال و حرام سے بے نیاز قصاب کا چھرا تھا۔ اس نے فوٹوگرافی کے بجائے مصوری کے فرائض اپنے اُوپر تھوپ لیے تھے اور جس طرح چاہا ویسی تصویر بنا کر بزعم خویش اپنے قلم کی داد حاصل کی۔

(ب) اس نے بظاہر قانون و انتظام کے مسئلے کو سامنے رکھا لیکن جو کچھ لکھا اس پر سیاست و انتقام کا رنگ غالب رہا۔ قادیانیت کی پوری تاریخ کو نظرانداز کر دیا اور غالباً سی آئی ڈی کے دانشوروں کو اس کا شعور ہی نہ تھا لیکن ماضی مرحوم میں احرار کی سیاسی شکستوں کے پیش نظر جو بھی ثقہ و غیر ثقہ روایت مل گئی اس کو اس مفروضہ پر جوڑ توڑ لیا کہ تحریک پاکستان کے سلسلہ میں احرار سے لیگ کی ناراضی کا اجتماعی ذہن اس کی توثیق و تسلیم کے لئے کافی ہوگا۔

(ج) ایک چیز جو ان رپورٹوں میں شروع سے آخر تک موجود ہے وہ ارباب انتظام بالخصوص پولیس کے افسرانِ مجاز کا طرزِ عمل ہے کہ وہ نصف صدی سے زائد کی اس کش مکش کو بار بار "احمدی احرار نزاع" کا نام دیتے رہے۔

نظر بہ ظاہر اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ قادیانی حکومت کے مختلف صیغوں میں بڑے سے بڑے عہدوں پر فائز تھے اور افسرانِ مجاز ان کے شعوری یا غیر شعوری احترام یا خوف میں محصور تھے۔ دوسری طرف احرار سیاست میں ایک شکست کھائی ہوئی جماعت تھے۔ ان کے لئے لیگ کا سیاست خانہ اپنی ہی فراہم کی ہوئی نارسائیوں کے باعث اجنبی تھا۔ بیوروکریسی کی عادت مستمرہ

ہے کہ وہ کسی مسئلے اور اس کی نوعیت کو نہیں دیکھتی بلکہ جو لوگ پیش کر رہے ہوں ان کے اجزائے نسب اور اعضائے حسب کی جانچ میں منفی ذہن سے کام کرتی ہے عوام یا حکومت کے خزانۂ عامرہ سے لاکھوں روپیہ بطور تنخواہ وصول کرنے کے بعد جو شاہکار تصنیف کرتی ہے اس کے نادر نمونے سی آئی ڈی کی ان زیر بحث یادداشتوں میں بکثرت موجود ہیں۔

## نادر نمونے

ان یادداشتوں میں افسران مجاز شروع سے آخر تک اس بات پر زور دیتے رہے ہیں کہ:

"احرار احمدیوں کے خلاف دشنام طرازی کی مسلسل مہم چلا رہے ہیں۔

(صفحہ ۱۵ محررہ ۳۱ اگست ۱۹۵۰ء)

احرار مقرروں نے میرزا غلام احمد کو ماسٹر تارا سنگھ سے تشبیہ دی اور چودھری ظفر اللہ خان کے خلاف توہین آمیز اشارات کئے انہیں مسلمان قوم کا غدار بتایا۔ جماعت احمدیہ کے بانی اور اس کے موجودہ امام کے متعلق فحش باتیں کیں۔ (صفحہ ۱۷)

مجلس احرار احمدیت کے بانی اور اس کے موجودہ امام کے متعلق فحش اور غلیظ باتیں تو کرتی ہے اب اس نے دانستہ بھی اور نادانستہ بھی تشدد کی حمایت شروع کر دی ہے۔

احرار برصغیر کی تقسیم کے خلاف تھے ان پر کانگرس اعتبار کرتی تھی اور وہ ہمیشہ کانگرس کے کارکنوں سے خلاملا رکھتے تھے۔ (صفحہ ۱۹ محررہ ۱۹ جون ۱۹۵۰ء)

احرار نے اپنی پوری توجہ احمدیوں کی بدگوئی پر مرتکز کر دی اور نہایت شرمناک دشنام طرازی کا آغاز کیا۔۔ میرزا غلام احمد کی تحریروں کے اقتباسات ناگوار حد تک نقل کئے جا رہے ہیں اور ان کو توڑ موڑ کر ان سے فحش اور غلیظ مطالب نکالے جاتے ہیں۔

میرزا غلام احمد اور موجودہ خلیفہ کو زناکار اور خلاف وضع فطرت حرکات کا مرتکب ظاہر کیا جا رہا ہے (صفحہ ۲۰)

احرار شائستگی کے حدود سے تجاوز کر چکے اور احمدیوں کے خلاف بے باک حملے کرتے رہے ہیں۔ (صفحہ ۳۴ یادداشت محررہ یکم اکتوبر ۱۹۵۱ء)

بخاری ہرگز باز نہیں آتے گا کیونکہ اس کا اس کے سوا اور کوئی وصف ہی نہیں کہ وہ احمدیوں کو گالیاں دیتا رہے منڈی اور ہٹیلا آدمی ہے۔

(صفحہ ۳۸ محررہ ۱۴ ار نومبر ۱۹۵۱ء)

احرار احمدی نزاع روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔ (صفحہ ۳۸ یکم دسمبر ۱۹۵۱ء)

اس میں شک نہیں کہ احراری لیڈر اور کارکن ہماری مملکت کی سلامتی اور اس کے امن وامان کو تباہ کرنے پر تلے ہوتے ہیں اور احمدیوں کے خلاف نفرت پیدا کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ ان کا ظاہری مقصد تو احمدیوں، ان کے خلیفہ اور سر ظفر اللہ خان کو بدنام کرنا ہے لیکن ان کا اندرونی مقصد یہ ہے کہ ہمارے ملک میں بدنظمی اور لاقانونی پیدا کریں۔ (صفحہ ۲۴ محررہ ۲۸ مارچ ۱۹۵۱ء)

احرار بجائے خود ایک مسئلہ ہیں۔ (لیکن قادیانی ؟ مؤلف)

(صفحہ ۵۰ محررہ ۵ اپریل ۱۹۵۲ء)

(قادیانی) اگر دوسرے اسلامی فرقوں کے افراد کو اپنے رسوم میں شامل ہونے کی اجازت نہیں دیتے یا غیر احمدی مسلمانوں کے ساتھ نماز یا دوسرے دینی وظائف میں شریک ہونے سے پورا اجتناب کرتے ہیں تو یہ خالصۃً ان کا ذاتی معاملہ ہے۔

(صفحہ ۵ محررہ ۳۰ مئی ۱۹۵۲ء)

بدقسمتی سے (لفظ بدقسمتی پر غور فرمائیے، مولف) عام مسلمانوں کا ذہنی رجحان احمدیوں کے خلاف ہے۔ (صفحہ ۵۳ محررہ ۳۰ مئی ۱۹۵۲ء)

آجکل جماعت احرار کا کام صرف یہ ہے کہ احمدیوں کے خلاف زہریلا پروپیگنڈا کیا جائے۔ (صفحہ ۵۶)

احرار عوام کی حمایت حاصل کرنے کی غرض سے اب تین نعرے استعمال کر رہے ہیں۔

۱ - مسئلہ ختم نبوت کی تبلیغ و اشاعت۔

۲ - احمدیوں کو اقلیت قرار دینے کا اعلان۔

۳ - چودھری ظفر اللہ خان کی موقوفی۔

جہاں تک نمبر ۱ کا تعلق ہے مرکزی حکومت واضح طور پر بتائے کہ ہمیں کیا راستہ اختیار کرنا چاہیئے۔ اس مطالبے کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ جیسے احرار اور بعض دوسرے مسلمان ردمیرزائیت کہتے ہیں۔ کیا ہمیں ان سرگرمیوں کی اجازت دینی چاہیئے یا ان کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیئے۔ جن کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے ملک کے باشندوں کی ایک قلیل سی جماعت کو سماجی یا مذہبی اعتبار سے نابود کر دیا جائے۔ احمدیوں کی جماعت مسلمہ عقائد پر قائم ہے اور غیر احمدیوں کے عقائد رنگا رنگ ہیں۔ اگرچہ آخر الذکر کو احمدیوں کے خلاف جوش و خروش کے اظہار کی اجازت دی جائے تو کیا احمدیوں کو بھی یہ حق دیا جائے گا کہ وہ منبر اور پلیٹ فارم سے صرف اپنے عقائد کو صحیح اور دوسرے تمام عقائد کو کفر قرار دیں۔ اگر ہم یہ حق جمہور کے کسی ایک طبقے کو دے دیں تو کیا ہم عیسائیوں کو یہ اجازت دینے کے لئے تیار ہوں گے کہ وہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اپنے خیالات کی اشاعت کریں؟ (حضورؐ کی ختم المرسلینی اور غلام احمد کی ظلی نبوت کو ایک دوسرے سے بریکٹ کرنا انتظامیہ ہی کے فکر رسا کی بوالعجبی ہو سکتی ہے۔ راقم) اور آیا ہم شیعوں کو بعض نامور ترین صحابہ کرام کے متعلق اپنے جذبات کے عام مظاہرے کا موقع دینے پر آمادہ ہوں گے؟ کیا مقصود یہ ہے کہ اس ملک کو متخاصم گروہوں اور مذہبوں کا میدان جنگ بنا دیا جائے تاکہ جو لوگ شکست کھا جائیں وہ تباہ ہو جائیں یا مذہب بدلنے پر مجبور کر دیئے جائیں۔ جس اژدھا کو احرار منظر عام پر لانا چاہتے ہیں اس کو اس کے خروج سے پہلے ہی ہلاک کر دینا چاہیئے ورنہ وہ ہماری آزادی اور ہمارے تمام مالوفات و محبوبات کو نگل جائے گا۔ (صفحہ ۔۔۔ جولائی ۱۹۵۲ء)

ارکان مرکز کو اس بات کا فیصلہ کرنا چاہیئے کہ احرار جو آخری دم تک پاکستان کے قیام کی مخالفت کرتے رہے ہیں اب پاکستان کو ختم کرنے کے لئے جو دباؤ ڈالنا شروع کیا ہے آیا وہ اس سے مغلوب ہو جائیں گے۔ مرکز کو جو کچھ بھی فیصلہ ہو اس سے حتی الامکان جلد از جلد ہر شخص کو مطلع کر دینا چاہیئے۔ (یادداشت مذکورہ صفحہ ۴۷)

منٹگمری کا ایک رسوائے عام احراری (زبان ملاحظہ ہو، مولف) کارکن جو حبیب الرحمٰن لدھیانوی کا چچیرا بھائی ہے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے ملکہ وکٹوریہ اور ملکہ الزبتھ کے متعلق جو کچھ کہا بہتر یہی ہے کہ اس کا ذکر نہ کیا جائے اس کا ذکر قابل اعتراض ہے۔ (صفحہ ۱۲۱)

محمد علی جالندھری ایک بدآہنگ سیاسی مقرر ہے۔

(صفحہ ۱۲۲ محررہ ۲۴ نومبر ۱۹۵۲ء)

سید عطاء اللہ شاہ بخاری کبھی باز نہیں رہ سکتے ان کے ذہن میں گالی کے سوا اور کچھ نہیں۔ (صفحہ ۱۲۳)

احرار مقررین کو چودھری ظفر اللہ خان اور بانیٔ جماعت احمدیہ کے خلاف علی الاعلان توہین آمیز باتیں کہنے سے روکا جائے۔ وہ عام طور پر اپنی تقریروں میں میرزا غلام احمد کو دجال کذاب اور زانی اور چودھری ظفر اللہ خان کو غدار اور دشمن پاکستان کہتے ہیں۔

(صفحہ ۱۲۵)

احراریوں کی اس شورش کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں اور احمدیوں کے تعلقات بہت کشیدہ ہو گئے ہیں۔ (صفحہ ۱۲۶)

ڈپٹی انسپکٹر جنرل سی آئی ڈی نے اپنی یادداشتوں میں کئی دفعہ اس بات پر اظہار خفگی کیا کہ سید عطا اللہ شاہ بخاری ملکہ وکٹوریہ اور ملکہ الزبتھ کا ذکر قابلِ اعتراض طریق سے کرتے ہیں مگر یادداشتوں میں اس سیاق وسباق کا ذکر قطعاً مفقود ہے جس

(۹) —— اسلامی ریاست۔

(۱۰) —— بین الاقوامی قوانین ومجالس اور اسلام۔

(۱۱) —— احادیث وسنن۔

(۱۲) —— کنونشن کے مطالبات۔

۶۔ احرار کی جماعتی دستار میں اس قسم کے موتی ٹانک دیئے گئے کہ:

الف۔ انہوں نے احمدیوں کے خلاف نہایت پست قسم کی دشنام طرازی اور مسخرگی سے کام لیا۔ ان کی پالیسی کا غالب اور بنیادی اصول یہ ہے کہ وہ کسی کے ماتحت ہو کر کام نہیں کریں گے۔ اسی اصول کے ماتحت وہ کانگرس سے علیحدہ ہوئے۔ گو اس کے بعد بھی انہوں نے کانگرس سے ملنے جلنے اور اس کے آگے دُم ہلانے کا رویہ جاری رکھا۔ (ججوں کی زبان ملاحظہ ہو۔ مؤلف)

ب۔ انہوں نے اپنے سیاسی مقاصد کے لئے مذہب کا مسلسل استعمال کیا۔ انہوں نے کانگرس کو ترک کیا تو مذہبی وجوہ کی بنا پر مسلم لیگ اور پاکستان کی مخالفت کی تو وہ بھی مذہب ہی کی بنا پر۔

ج۔ ان کی نیتوں کو مسٹر قربان علی خان انسپکٹر جنرل پولیس سے بہتر کوئی نہ جانتا تھا۔ (اللہ اکبر)

ان کے متعلق ہم نرم الفاظ استعمال کرنے سے قاصر ہیں۔ ان کا طرز عمل بطور خاص مکروہ اور قابل نفرین تھا —— کوئی احمق ہی ان کے دعوئ مذہبیت سے دھوکا کھا سکتا ہے۔ خواجہ ناظم الدین نے ان کو دشمن پاکستان قرار دیا اور وہ اپنی گزشتہ سرگرمیوں کی وجہ سے اسی لقب کے مستحق تھے۔[۱]

---

[۱] پاکستان کی سیاسی تاریخ فیصلہ کرے گی دشمن پاکستان احرار تھے یا سپریم کورٹ کے چیف جسٹس مسٹر محمد منیر:

ابر کی برق باریاں نہ گئیں

## تین حادثے

غرض احرار کے لئے تین حادثے جان گسل ثابت ہوئے ۔ پہلی بار شہید گنج کے جھگڑے میں آ گئے اور خواص کے ہاتھوں پٹنا پڑا ۔ دوسری دفعہ تحریک پاکستان میں عوام کی شدید ناراضی نے سیاسی طور پر گور کنارے پہنچا دیا ۔ تیسری بار قادیانیوں کے مقابلے میں ارباب اختیار کے قہر و غضب کا شکار ہو گئے ۔ اولاً شہرت کھوئی ثانیاً قیادت ثالثاً جماعت

گویا ہ

تھی اس خیال پہ بنیاد آشیانے کی
کہ بجلیوں کو تمنا ہے مسکرانے کی

## احمدیوں سے مسلمانوں کے اختلافات

بہرکیف فاضل ججوں نے رپورٹ میں تسلیم کیا :

۱ ۔ عامۃ المسلمین سے احمدیوں کے اختلافات کی عمر نصف صدی سے بھی زیادہ ہے ۔

۲ ۔ (ملک کی) تقسیم سے پہلے وہ کسی روک ٹوک کے بغیر اپنے پروپیگنڈے اور تبلیغی سرگرمیوں میں مصروف تھے ۔ قیام پاکستان سے صورت حالات بدل گئی اب احمدی یہ سمجھتے تھے کہ نقطۂ نگاہ یا نقطۂ کار کی تبدیلی کے بغیر بھی عوام میں، ان کی سرگرمیوں کے خلاف کوئی برہمی پیدا نہ ہو گی اور نئی مملکت میں ان سے کوئی تعرض نہ کیا جائے گا تو گویا وہ اپنے آپ کو دھوکا دے رہے تھے ۔

ان کی سرگرمیوں اور جارحانہ نشر و اشاعت میں بدلے ہوئے حالات کے باوجود کوئی تغیر پیدا نہ ہوا ۔ غیر احمدی مسلمانوں کے خلاف دل آزار باتیں برابر کہی جاتی رہیں ۔ میرزا محمود احمد کی کوئٹہ کی تقریر نہ صرف نامناسب بلکہ غیر مآل اندیشانہ اور اشتعال انگیز تھی ۔ اس تقریر میں انہوں نے بلوچستان کے صوبے کی پوری آبادی کو احمدی بنا لینے اور صوبے

اس بات نے مسلمانوں کے قلوب میں سخت رنج اور تلخی پیدا کر دی اور وہ احمدیت کو برطانیہ کی لونڈی خیال کرنے لگے۔ (رپورٹ انگریزی صفحہ ۱۹۶)

## عدالت کے ریمارکس

ہمارا منصب یہ نہیں کہ ہم اس بات کا فیصلہ کریں کہ آیا احمدی دائرہ اسلام سے خارج ہیں یا نہیں۔ ہم اس امر کا فیصلہ غیر احمدیوں پر چھوڑتے ہیں کہ وہ احمدیوں کی اس نئی پوزیشن کے بعد کہ میرزا غلام احمد نہ کوئی شریعت لایا نہ اصلی شریعت منسوخ کی اور وہ صرف ان معنوں میں نبی تھا کہ خدا نے اسے الہام میں اسی طرح ظاہر کیا تھا اور کوئی شخص میرزا صاحب کی وحی پر ایمان نہ لانے سے خارج از اسلام قرار نہیں دیا جاسکتا" (تلخیص) احمدیوں کو مسلمان سمجھیں یا نہ سمجھیں؟[2]

## علما کی شکست کا سبب

اس میدان "مجادلہ" میں علماء کو جو شکست ہوئی اس کی وجہ مذہب نہیں بلکہ خاص سیاست تھی جس کے پس منظر میں نصف صدی پرانی تاریخ تھی اس کے علاوہ رپورٹ کے بین السطور میں دو متضاد مدرسہ ہائے فکر کی آویزش صاف طور پر جھلکتی ہے۔

اولاً ملائیت جو اسلامی معاشرے میں زوال بغداد کے بعد ایک ناکارہ عنصر کی حیثیت رکھتی ہے جس نے قرآن کی قوت محرکہ کو اپنے انجماد سے منسلک کر لیا اور جس کا عقلی تعطل دینیاتی تفکر کو محیط ہے۔

---

[1] چار سے ستا نمبر تک کی تلخیصات مولانا مرتضیٰ احمد میکش کے محولہ تراجم سے ماخوذ ہیں۔

[2] میرزائیوں نے انکوائری کمیٹی کے روبرو مسلمانوں کے متعلق جو نئی پوزیشن اختیار کی اس کی راستی کا اندازہ میرزا غلام احمد قادیانی کے اس "فتویٰ" سے کیا جاسکتا ہے کہ "عدالتی مقدمات و بیانات میں اپنے فائدہ اور رہائی کے لئے جھوٹ بولنا جائز ہے" (ذکر حبیب مرتبہ مفتی محمد صادق صفحہ ۴۷۶)

ثانیاً جدیدیت جس کی عمر مسلمانوں میں سو برس سے زائد نہیں اور جس کا دماغ یورپی فلسفے کے ان عقلی سانچوں میں ڈھلا ہے جو مذہب وسیاست کو دو مختلف خانوں میں رکھتے اور بسااوقات ایک دوسرے کے گریبان پہ ہاتھ ڈالتے نظر آتے ہیں ان کے نزدیک مذہب محض عقیدہ ہے اور عقیدہ انسان کا انفرادی معاملہ۔ اس دلچسپ تکرار ہی کا نتیجہ تھا کہ علما نے اپنے کہن سال نظریوں سے باہر جھانکنا گوارا نہ کیا اور فضلا (جدید تعلیم یافتہ) نے ان کی سیاسی نامرادیوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کے فکر و نظر کی توضیحات قبول نہ کیں۔

## علامہ اقبالؒ کے نظریات

علامہ اقبال (علیہ الرحمۃ) کی بالغ نظری کو جدید وقدیم کی اس چپقلش کا تازیست احساس رہا۔ آپ نے احمدیت کے مسئلہ پر جو مضامین لکھے ان میں کئی جگہ اس عقدہ کو اپنے ناخن فکر سے کھولا ہے۔ فرماتے ہیں:

"نام نہاد تعلیم یافتہ مسلمانوں کو ختم نبوتؐ کے عقیدے کی پوری سمجھ نہیں۔ انہوں نے ختم نبوتؐ کے تمدنی پہلو پر کبھی غور نہیں کیا۔ مغربیت کی ہوا نے انہیں حفظ نفس کے جذبے ہی سے عاری کر دیا ہے"۔ (حرف اقبال صفحہ ۱۵۴)

حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کا نقطۂ نگاہ یہ تھا کہ:

۱۔ ہندوستان میں اسلامی دینیات کی جو تاریخ ۱۷۹۹ء سے شروع ہوتی ہے اس کی روشنی ہی میں احمدیت کے اصل مظروف سمجھے جا سکتے ہیں۔ دنیائے اسلام کی تاریخ میں ۱۷۹۹ء کا سال بے حد اہم ہے اسی سال ٹیپو کو شکست ہوئی، اسی سال جنگ نوارینو وقوع پذیر ہوئی جس میں ترکی کا بیڑا تباہ ہو گیا۔ سلطان ٹیپو علیہ الرحمۃ کے مزار پر مندرجہ تاریخ شہادت کندہ ہے۔ ؎

ذھب عن الروم و الھند کلھا

ترجمہ: ہندوستان اور روم کی عظمت ختم ہو گئی۔

۲۔ سلطان شہید کی شکست اور مغربی شہنشاہیت کی ایشیا میں آمد کے بعد اسلامی

27449945-Sawaneh-...
یہ مناسب ہے کہ اصل جماعت کو رواداری کی تلقین کی جائے حالانکہ اس کی وحدت خطرے میں ہو اور باغی گروہ کو تبلیغ کی پوری اجازت ہو۔ اگرچہ وہ تبلیغ جھوٹ اور دشنام سے لبریز ہو۔

## علیحدگی کا مطالبہ

۱۔ اگر کوئی گروہ جو اصل جماعت کے نقطۂ نظر سے باغی ہے اور حکومت کے لئے مفید ہے تو حکومت اس کی خدمات کا صلہ دینے کے لئے پوری طرح مجاز ہے لیکن وہ جماعت اگر ایسی قوتوں کو نظر انداز کر دے جو اس کے اجتماعی وجود کے لئے خطرہ ہیں تو یہ ایک عبث توقع ہے۔

۲۔ میری رائے میں حکومت کے لئے بہترین طریق کار یہ ہوگا کہ وہ قادیانیوں کو ایک الگ جماعت تسلیم کر لے۔ یہ قادیانیوں کی پالیسی کے عین مطابق ہوگا اور مسلمان ان سے ویسی ہی رواداری سے کام لیں گے جیسی وہ باقی مذاہب کے معاملے میں اختیار کرتے ہیں۔

۳۔ قادیانیوں کی تفریق کی پالیسی کے پیش نظر جو انہوں نے مذہبی اور معاشرتی معاملات میں ایک نئی نبوت کا اعلان کر کے اختیار کی ہے۔ خود حکومت کا فرض ہے کہ وہ قادیانیوں اور مسلمانوں کے بنیادی اختلافات کا لحاظ رکھتے ہوئے آئینی قدم اٹھائے اور اس کا انتظار نہ کرے کہ مسلمان کب ان کی علیحدگی کا مطالبہ کرتے ہیں۔

180

۴۔ اسلام لازماً ایک دینی جماعت ہے جس کے حدود مقرر ہیں یعنی وحدت الوہیت پر ایمان، انبیا پر ایمان اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم رسالت پر ایمان دراصل یہ آخری یقین ہی وہ حقیقت ہے جو مسلمان اور نامسلمان کے درمیان وجۂ امتیاز ہے۔ ایران میں بہائیوں نے ختم نبوت کے اصول کو صریحاً جھٹلایا لیکن ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی تسلیم کر لیا کہ وہ الگ جماعت ہیں اور مسلمانوں میں شامل نہیں ہیں۔

۵۔ ہمیں قادیانیوں کی حکمت عملی اور دنیائے اسلام سے متعلق ان کے رویے کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے۔ بانی تحریک نے ملت اسلامیہ کو سڑے ہوئے دودھ اور

مرتب کی اور اس تلخیص پر فارابی اور ابن سینا نے جو مضامین حوالہ قلم کئے اور اب ڈیماستھینز (۳۲۲ ق م) اور سسرو (۱۰۶ ق م) وغیرہ کے سوانحی خطوط سے خطابت کے جو اصول معلوم ہوتے ہیں حتیٰ کہ ایڈمنڈ برک صہبان ابن غزال اور سعد زغلول وغیرہ کے مطالعے سے خطابت کی جن راہوں پر قدم اٹھتے ہیں اس گئے گزرے دور میں شاہ جی ان کی صحیح تصویر تھے۔ انہوں نے اس میدان میں ہر جہت سے ملک و قوم کی خدمت کی۔ علامہ ابن رشد کے متعلق روایت ہے کہ ان کی زندگی میں صرف دو راتیں ایسی تھیں جو مطالعہ سے خالی رہ گئیں۔ پہلی شادی کی رات دوسری جب ان کے والد کا انتقال ہوا۔

شاہ جی نے سی سالہ خطابتی زندگی کی ننانوے فی صد راتیں عوام سے مخاطبت میں بسر کیں۔ انہوں نے مذہب، سیاست، زبان تینوں کی خدمت کی۔ اگر وہ روایتی تبلیغی زندگی بسر کرتے تو سارا ہندوستان ان کے قدموں پر ہوتا۔ خود مسلمان قوم ان کی مورتی تراش لیتی لیکن انہوں نے سالہا سال مذہب کے نام پر تراشے گئے بُت توڑے۔ اس مہم میں انہیں ایسی ایسی جگہ جانا پڑا جہاں مسلمان کہلانے والے تو موجود تھے لیکن ان کے نام تک مسلمان نہ تھے۔ اسی پنجاب میں بے شمار آبادیاں ایسی تھیں جہاں مسلمانوں کو کلمۂ شہادت ایک طرف رہا السلام علیکم کہنا نہ آتا تھا۔ ان میں ہندومت کے زمانہ زوال کی رسمیں عقیدہ کے طور پر مروج تھیں۔ لوگوں میں مذہب، ایک آبائی ورثہ رہ گیا تھا کئی علاقوں میں صورت حال کا نقشہ یہ تھا کہ غیر اللہ کی پرستش ہی کو اصل اسلام سمجھا جاتا ——— شاہ جی نے ان دور افتادہ علاقوں کا قصد کیا تو ان کی راہ میں بیسیوں سفری موانعات تھے۔ ایک حصہ ریل میں طے کیا دوسرا لاری میں تیسرا گھوڑے کی پیٹھ پر چوتھا پیدل، پھر کئی دفعہ میلوں پیدل ہی چلتے گئے جس علاقے میں جاتے وہاں عام لوگ ان کی زبان نہ سمجھتے کچھ دن وہاں رہ کر مقامی لفظوں کا ایک ذخیرہ فراہم کرتے۔ تب ایک دلچسپ خطابتی تگ و دو کے بعد اُن کے دل و دماغ کو راضی کرتے۔ غرض اس باب میں ان کے کارنامے بڑے ہی قابل قدر تھے مثلاً

۷۔ عام مسلمانوں کو قرآناً اور اسلاماً سمجھایا کہ انسانی فضیلت کی بنیادیں خاندانی تفاخر پر قائم نہیں ہوتیں بلکہ ہر انسان اپنے علم و دیانت اور زہد و تقویٰ کے باعث قابل تکریم ہے۔

۸۔ انگریزوں نے ملا کو تلقین جہاد کی پاداش میں بہار کے گھسیاروں کی سطح پر لا کھڑا کیا تھا یعنی خوانین علاقہ انہیں کمین سمجھتے تھے اور امتداد زمانہ نے انہیں ٹکڑ گدا بنا دیا تھا۔ شاہ جی علماء کی اس اہانت کے خلاف نہ صرف سینہ سپر ہوگئے بلکہ ان کی بحالیٔ عزت کو اپنے اُوپر فرض کر لیا۔

۹۔ تمام صوبوں میں بے شمار دینی مدرسے کھلوائے اور انہیں خود مکتفی بنانے کیلئے عامۃ المسلمین سے زرِ اعانت فراہم کیا۔

۱۰۔ قرآن مجید کی بعض آیات کے ان غلط ترجموں کو فاش کیا جن میں انگریزوں کی مصلحتوں کو مقدم رکھا گیا تھا۔

۱۱۔ کلام اللہ کی ان آیات کو تقریروں میں بیان کرنا شروع کیا جنہیں ایک مدت سے زخم رسیدہ علماء نے انگریزی دبدبے کے خوف سے طاق نسیاں پر رکھ چھوڑا تھا۔

۱۲۔ انگریزوں کی "غدر" میں فتوحات کے بعد عیسائی مشنریوں کے حوصلے بہت بڑھ گئے تھے انہوں نے حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کو اپنی بدگوئی کا مرکز بنا رکھا تھا۔ جس سے ہفوات کا ایک لایعنی دفتر تیار ہوگیا۔ اس فتنے کے بانی یوپی کے لیفٹیننٹ گورنر سر ولیم میور تھے ان کی دیکھا دیکھی ہندوؤں بالخصوص آریہ سماجیوں نے بھی منہ کھولا جس سے بالآخر شدھی کی تحریک پیدا ہوئی۔ اس تحریک نے لیکھرام اور راجپال پیدا کئے۔ شاہ جی نے ناموس پیغمبرؐ کی حفاظت کا ایک ایسا ذہن تیار کیا کہ راجپال کی دریدہ دہنی پر جسٹس دلیپ سنگھ کا فیصلہ تعزیرات ہند میں نہ صرف ۱۹۲ الف کے ایزاد کا موجب بنا بلکہ مسلمانوں نے اس فرض کو اپنے ہاتھوں پورا کر کے ان بدسگالوں کا راستہ بند کر دیا جن کی بے قابو زبانیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف قینچی کی طرح چلتی تھیں۔

## شاہ جی کا جادو

لیکن بعض خصوصیتیں صرف شاہ جی کے لئے مخصوص تھیں۔ مثلاً وہ مخاطبین کو سوچنے کا موقع ہی نہیں دیتے تھے اس تیزی سے سامعین کو اپنے ساتھ بہالے جاتے کہ ان میں حرکت یا جذبے کے سوا کوئی چیز باقی نہ رہتی۔ سب سے بڑی بات عوام سے ان کی محبت تھی وہ عوام میں گھلتے ملتے اور انہیں جھنجوڑتے جگاتے تھے ان کے لہجے میں سختی تھی درشتی نہیں غصہ تھا انتقام نہیں۔ وہ جانتے تھے کہ الفاظ کی طاقت ہی اصل طاقت ہے انہیں احساس تھا کہ ہر بات جو زبان سے ادا ہو وہ امام شافعی کے الفاظ میں پتھر سے زیادہ سخت، سوئی سے زیادہ چبھنے والی، ایلوے سے زیادہ کڑوی، چکی کے پاٹ سے زیادہ بھرنے والی اور نوک سناں سے زیادہ تیز ہوتی ہے۔ ان کے ہاں ہر سخن کی ترازو تھی۔ ان کے الفاظ تُل کر نکلتے تھے ان کے ہاں طنز تھا سخت قسم کا طنز لیکن سب وشتم نہیں۔ جن چیزوں سے نفور رہتے تھے ان سے تمسخر بھی روا رکھتے۔ ان کے ہاں اس تمسخر یا پھکڑ کی زد سب سے زیادہ میرزا غلام احمد قادیانی اور ان کی ذریات پر پڑتی۔ یا پھر وہ رجعت پسند قوتیں جن سے ملک و قوم کو نقصان پہنچ چکا یا پہنچ رہا تھا۔ چیسٹرٹن کے نزدیک طنز یا سٹائر کے معنی ہیں ایک سوّر کو اس سے بھی زیادہ مکروہ شکل میں پیش کرنا جیسا کہ خود خدا نے اس کو بنایا ہے۔ لیکن ایک دوسری تعریف یہ ہے کہ بعض طنزیں صحیح ہوتی ہیں۔ بعض محض دلچسپ لیکن سب سے زیادہ مؤثر وہ ہوتی ہیں جو برجستہ ہوں۔ شاہ جی کے ہاں پہلو دار طنزیں مطلق نہیں تھیں۔ صرف برجستہ طنزیں تھیں جو عوام کے منفی جذبات متشکل کرنے میں خاصی مؤثر ہوتی ہیں ؎

آغشتہ ایم ہر سرِ خارے بہ خونِ دل

قانونِ باغبانیٔ صحرا نوشتہ ایم

چراغ حسن حسرت نے ان کی تقریر کو غزل سے تشبیہہ دی ہے کہ اس کا ہر شعر علیحدہ اور مکمل ہوتا ہے۔ یہ وصف عوامی خطابت کی جان ہے جو بات اسٹیج سے کہی جائے اس میں

دیوار پر نقشہ لٹکا کر فوج کے حملوں کی نشاندہی کرتے اور اس ضمن میں مختلف احوال پر روشنی ڈالتے۔ میرزا صاحب کی یہ تمام معلومات قادیانی المذہب فوجی افسروں اور وزارت خارجہ کے ان کارکنوں کی مہیا کی ہوتیں جو چودھری ظفر اللہ خان کی ہدایت پر انہیں ملتے اور سرکاری اطلاعات بہم پہنچاتے تھے۔ میرزا صاحب نے عام مسلمانوں سے بلا کھٹکے مخاطب ہونے کی یہ پہلی جسارت کی تھی ورنہ اس سے پہلے وہ مسلمانوں کے کسی بھی جلسے کو خطاب کرنے سے محروم تھے۔ ایک دفعہ غالباً ۱۹۲۰ء میں انہوں نے بریڈلا ہال میں سیرت کے موضوع پر خطاب کرنا چاہا تو مسلمانوں نے جلسہ اُلٹا دیا اور میرزا صاحب ٹوک دم بھاگ گئے۔ راقم نے تب ان کی بھگدڑ خود دیکھی تھی کہ ایک موٹر میں بیٹھ کر اڑنچھو ہوگئے تھے۔

## ربوہ

میرزا محمود نے سب سے پہلے اپنے لئے ایک قلعہ کی ضرورت محسوس کی چنانچہ چنیوٹ ضلع جھنگ کے پاس دریائے چناب کے پار لائل پور اور سرگودھا کے وسط میں سر فرانسس موڈی گورنر پنجاب سے کوڑیوں کے بھاؤ ۱۰۳۴ ایکڑ زمین لے کر ربوہ آباد کیا۔ یکم اپریل ۱۹۴۹ء کو ربوہ ریلوے اسٹیشن بھی قائم ہوگیا۔ اسٹیشن ماسٹر ایک قادیانی مقرر ہوا۔ غرض ربوہ کا پورا انتظام ایک ریاست کے نظام کے مشابہ ہے، کہا جاتا ہے کہ ربوہ میں اتنا اسلحہ ہے کہ پاکستان کے بڑے سے بڑے شہر میں بھی اتنا اسلحہ نہ ہوگا۔ ہر میرزائی کے لئے مسلح ہونا" احکامِ خلافت" کی رُو سے لازم ہے۔

قیامِ پاکستان سے دو سال تک حکومت کے مختلف شعبوں میں میرزائی داخل ہوتے رہے حتیٰ کہ بعض بنیادی محکموں میں انہیں رسوخ حاصل ہوگیا۔ بالخصوص فوج، مالیات اور خارجہ کے محکموں میں ان کی جڑیں خاصی گہری ہوگئیں۔

پاکستان بن جانے سے پہلے "الفضل" نے کبھی فوجی بھرتی کے پروگرام شائع نہیں کئے تھے لیکن پاکستان بن جانے کے بعد الفضل میں فوجی بھرتی کے پروگرام بہ التزام

شائع ہونے لگے۔ بالخصوص ان علاقوں کے پروگرام جہاں میرزائی رہ رہے تھے اور جس دستہ کے ریکارڈنگ آفیسر میرزائی ہوتے۔ اسی طرح سول کے قادیانی افسروں بالخصوص ڈپٹی کمشنرز وغیرہ نے احمدیت کی تبلیغ کا بیڑہ اٹھایا۔ فروری ۱۹۵۳ء سے پہلے مسٹر ایم احمد منٹگمری (ساہیوال) میں ڈپٹی کمشنر تھے انہوں نے کھلم کھلا احمدی مبلغوں کے لئے راستہ پیدا کیا جس سے مسلمانوں میں مزاحمت کا جوش پیدا ہو گیا۔ چنانچہ منٹگمری کے ڈپٹی کمشنر کا ذکر جسٹس منیر نے بھی اپنی رپورٹ میں کیا ہے کہ ان قادیانی افسروں کی جانبداری کے باعث مسلمانوں میں مزاحمانہ ردعمل کا پیدا ہونا ناگزیر تھا۔

یہ سب کچھ محض تبلیغ نہیں تھا بلکہ قادیانی ریاست قائم کرنے کا ایک منصوبہ تھا جس کے خطوط انگریزوں کے عہد میں تیار ہوئے لیکن جس کی جھلکیاں پہلی دفعہ باونڈری کمیشن کے وقت سامنے آئیں اور پاکستان بن جانے کے بعد میرزا محمود بزعم خویش میدان خالی پا کر قادیانی ریاست بنانے کی دھن میں لگ گئے۔

علامہ اقبالؒ نے کہا ہے کہ احمدیت اپنے افکار و اعمال میں یہودیت کا مثنیٰ ہے جس طرح دنیا بھر کے یہودی امریکہ و برطانیہ میں وہاں کی معاشیات کو کنٹرول کرتے ہیں اور ان کی فوج میں رسوخ رکھتے ہیں اسی طرح میرزا محمود کا پلان تھا اور ان کے جانشین بھی اسی نہج پر جا رہے ہیں کہ پاکستان میں فوج کو ہاتھ میں لیا جائے، کچھ عرصہ سے پاکستان کی اقتصادیات کو بھی تصرف میں لینے کی کوشش ہو رہی ہے، چنانچہ بنکوں میں قادیانی گھس رہے ہیں اور اب لاتعداد انشورنس کمپنیوں پر سرکاری قبضہ کے بعد اکثر قادیانی حکومت کی بدولت ان کے نگران ہوتے جا رہے ہیں۔

میرزا محمود کا خیال تھا کہ پاکستان ایک ایسا ملک ہے کہ اس کی حکمرانی بالآخر فوج کے ہاتھ میں ہو گی لہذا احمدیوں کا فرض ہے کہ وہ فوج میں اس کثرت سے شامل ہو جائیں کہ بالآخر فوج انہی کی ہو جائے۔

میرزا صاحب نے ایک خطبہ میں فرمایا :-

"جب تک سارے محکموں میں ہمارے آدمی نہ ہوں ان سے جماعت پوری طرح کام نہیں لے سکتی۔ مثلاً موٹے موٹے محکموں میں سے فوج ہے، پولیس ہے، ایڈمنسٹریشن ہے، ریلوے ہے، فنانس ہے، اکاؤنٹس ہے، کسٹمز ہے، انجنیرنگ ہے۔ یہ آٹھ دس موٹے موٹے صیغے ہیں جن کے ذریعے جماعت اپنے حقوق محفوظ کرا سکتی ہے اور پیسے بھی اس طرح کمائے جا سکتے ہیں کہ ہر صیغے میں ہمارے آدمی موجود ہوں اور ہر طرح ہماری آواز پہنچ سکے۔"

(الفضل ۱۱ر جنوری ۱۹۵۲ء)

اسی سال ۱۶ر جنوری کو ارشاد ہوتا ہے کہ :

"۱۹۵۲ء کو گزرنے نہ دیجئے۔ جب تک احمدیت کا رعب دشمن اس رنگ میں محسوس نہ کرے کہ اب احمدیت مٹائی نہیں جا سکتی اور وہ مجبور ہو کر احمدیت کی آغوش میں آگرے۔"

(الفضل ۱۶ر جنوری ۱۹۵۲ء)

میرزا صاحب نے اس سے پہلے دسمبر ۱۹۵۱ء کو جماعت کے سالانہ اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے اعلان کیا تھا کہ :

"وقت آنے والا ہے جب یہ لوگ (مخالفین و منکرین) مجرموں کی حیثیت میں ہمارے سامنے پیش ہوں گے۔"

الفضل ۲۹ر جولائی ۱۹۵۲ء صفحہ ۶ میرزا صاحب کے خطبہ کا آخری فقرہ ہے

"اپنا یا بیگانہ کوئی اعتراض کرے پروا نہیں، ہونا وہی ہے جو میں نے کہا ہے اور وہی ایک دن ہم کر کے رہیں گے۔"

وہ کیا تھا؟ میرزا صاحب نے ۲۳ر جولائی ۱۹۴۸ء کو یعنی پاکستان بننے کے تقریباً پونے گیارہ ماہ بعد کوئٹہ میں ایک خطبہ دیا جس میں اعلان فرمایا کہ وہ بلوچستان کو احمدی صوبہ

214

## فرقان بٹالین

میرزا محمود نے ستمبر ۱۹۴۷ء کو رتن باغ لاہور میں مجلس شوریٰ بلائی ۔ اور اپنے



عمزاد ایم ایم احمد ڈپٹی کمشنر سیالکوٹ کے ایما پر جموں کی سرحد پر واقع گاؤں معراجکے میں چالیس پچاس قادیانیوں کی ایک کمپنی تعینات کی۔ ان کی کمان اپنے بھائی میرزا مبارک احمد کے حوالے کی۔ جون ۱۹۴۸ء میں فرقان بٹالین قائم کی۔ یہ بٹالین تاریخ احمدیت کی روایت کے مطابق دو سال تک کشمیر کے محاذ پر لڑتی رہی۔ اس کا کیمپ سرائے عالمگیر کے قریب بنایا گیا۔ میرزا محمود امین الملک کا نام رکھ کر اس بٹالین کے کارناموں کا مشاہدہ کرنے محاذ پر گئے۔ اس فوج میں تاریخ احمدیت (صفحہ ۱۷۶) کے مطابق کوئی تین ہزار افراد تھے جن میں ہر حلقہ کے احمدی شامل تھے۔ خاندان مسیح موعود کے افراد، مبلغین احمدیت، مدرسہ احمدیہ، جامعہ احمدیہ اور تعلیم الاسلام کالج و اسکول کے اساتذہ و طلبہ، ڈاکٹر، زمیندار، دوکاندار، کلرک۔

فرقان بٹالین کا مقصد ایک تو یہی تھا کہ قادیانی اپنے سیاسی منصوبے کا راستہ صاف کرنا چاہتے تھے اور یہ ان کی عسکری تربیت کا پاکستان میں پہلا اجتماعی مظاہرہ تھا۔ اس کے علاوہ اسلحہ فراہم کرنا ان کا مقصود تھا۔ پونچھ کے مفتی اعظم کے الفاظ میں میرزائی اپنے اغراض مشؤمہ کو پروان چڑھانے کے لئے فرقان بٹالین کو معرض وجود میں لائے تھے۔ اس بٹالین پر یہ بھی شبہ کیا گیا کہ اس کی معرفت ہندوستانی فوج کو اطلاعات مل رہی ہیں لیکن یہ امر چونکہ حکومت کے انٹیلی جنس بیورو تک محدود تھا اس لئے اس باب میں صحیح معلومات معلوم نہ ہو سکیں۔ بہر حال حکومت کی خفیہ اطلاعات اور چیدہ چیدہ علما کے بیانات کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۵ جون ۱۹۵۵ء کو فرقان بٹالین توڑ دی گئی۔ یہ چیز اب ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ ریاست کشمیر میں ابتداً پاکستانی فوج کے نہ لڑنے اور ہندوستان میں جنرل آکن لیک کو اس سلسلہ کی معلومات مہیا کرنے کا واحد ذریعہ پاکستانی فوج کا کمانڈر انچیف

۱۳؍اپریل ۱۹۴۷ء کو چودھری ظفر اللہ خان کے بھتیجے کا نکاح تھا، میرزا صاحب نے فرمایا۔

" ہمیں کوشش کرنی چاہیئے کہ ہندو مسلم سوال اٹھ جائے، ساری قومیں شیر وشکر ہو کر رہیں۔ ملک کے حصے بخرے نہ ہوں ــــــ ممکن ہے عارضی طور پر کچھ افتراق ہو اور کچھ وقت کے لئے دونوں قومیں جدا جدا ہوں مگر یہ حالت عارضی ہو گی ہمیں کوشش کرنی چاہیئے کہ یہ حالت جلد دور ہو جائے۔ بہر حال ہم چاہتے ہیں کہ اکھنڈ ہندوستان بنے اور ساری قومیں باہم شیر وشکر ہو کر رہیں"۔

(الفضل ۵؍اپریل ۱۹۴۷ء)

۱۴؍مئی ۱۹۴۷ء کو بعد از مغرب مجلس علم وعرفان میں فرمایا۔

" اللہ تعالیٰ کی مشیت ہندوستان کو اکٹھا رکھنا چاہتی ہے، ہندوستان کی تقسیم پر اگر ہم راضی ہوئے تو خوشی سے نہیں بلکہ مجبوری سے پھر یہ کوشش کریں گے کہ جلد سے جلد تر متحد ہو جائیں"۔

منیر انکوائری رپورٹ کے مولفین نے بھی قادیانی امت کی اس روش کو تسلیم کیا ہے کہ وہ برعظیم کی تقسیم کے مخالف تھے اور قادیان کا حصول ان کے عقیدہ کا جزو لاینفک ہے، میرزا محمود نے اس غرض سے ۲۹ دسمبر ۱۹۵۶ء کو اپنے ایک خطبہ میں کہا،

" مایوس نہ ہونا، خدا تعالیٰ پر توکل کرو۔ اللہ تعالیٰ کچھ عرصہ کے اندر ایسے سامان پیدا کر دے گا آخر یہودیوں نے ۱۳ سو سال انتظار کیا۔ پھر فلسطین میں آگئے۔ آپ لوگوں کو تیرہ سو سال انتظار نہیں کرنا پڑے گا ممکن ہے ۱۳ بھی نہ کرنا پڑے ممکن ہے دس بھی نہ کرنا پڑے۔ اللہ تعالیٰ اپنی برکتوں کے نمونے تمہیں دکھائے گا"۔ (الفضل ۱۵؍مارچ ۱۹۵۷ء)

## ۱۹۶۵ء کی جنگ

۱۹۶۵ء کی جنگ سے متعلق نواب کالاباغ گورنر مغربی پاکستان نے اپنے کئی دوستوں

## ۱۹۶۵ء کی جنگ

۱۹۶۵ء کی جنگ سے متعلق نواب کالاباغ گورنر مغربی پاکستان نے اپنے کئی دوستوں



سے بیان کیا اور راقم کو بھی عندالملاقات یہ کتھا سنائی کہ ۱۹۶۵ء کی جنگ سے پہلے جنرل ملک اختر حسین مجھ سے ملنے آئے۔ میں نے پس و پیش کیا۔ آخر ان کے زور دینے پر ملاقات ہوئی تو پتہ چلا کہ وہ کشمیر کے محاذ پر جنگ کرنا چاہتے ہیں لیکن ایوب خان نہیں مانتے میں ایوب سے کہوں کہ حصول کشمیر کے لئے یہ بہترین وقت ہے۔ میں جانتا تھا کہ اختر ملک قادیانی ہیں اور میرے پاس وہ ہینڈ بل بھی آ چکا تھا جو مرزائیوں نے کشمیر میں تقسیم کرایا تھا کہ مسیح موعود کا زمان ہے کشمیر میری اُمت کے ہاتھوں فتح ہوگا۔ نواب صاحب نے ۱۹۶۵ء کی جنگ کو بین الاقوامی سازش کا حصہ قرار دیتے ہوئے ساری کہانی بیان کی کہ پاکستان کو تاراج کرنے کے لیے کن لوگوں نے کیا عمل کیا؟

نواب کالاباغ حقیقتہً فیلڈ مارشل ایوب خان کے غایت درجہ وفادار تھے ان پر کبھی تنقید کرتے تو عموماً دو چیزوں پر اظہار ناراضی فرماتے۔ اولاً یہ کہ ان کے گرد و پیش لادین عناصر جمع ہو گئے ہیں ثانیاً ان کے مزاج میں قادیانی دخیل ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ روایت خود مجھ سے ایس آئی حق سابق چیف سیکرٹری مغربی پاکستان نے بیان کی کہ مرکزی کابینہ کی ایک میٹنگ میں علماء کا مسئلہ زیر بحث تھا۔ ایم ایم احمد بھی شریک تھا۔ اکثر وزراء نے زور دیا کہ علماء اس ملک کے لئے رجعت و مصیبت کا باعث ہو گئے ہیں انہیں گردن زدنی اول کے مصداق کھونٹے پہ باندھا جائے۔ ساری کابینہ متفق نظر آ رہی تھی کہ مسٹر اے ٹی ایم مصطفےٰ نے شدت سے مخالفت کی اور یہاں تک فرمایا کہ "علماء کی آڑ میں اسلام کی مخالفت ہو رہی ہے کوئی غلط فیصلہ ہوا تو وہ کابینہ سے استعفیٰ دے دیں گے۔ اسی اجلاس میں نواب کالاباغ نے ایم ایم احمد کو گھورتے ہوئے کہا کہ جن مولویوں سے آپ لوگ نالاں ہیں ان کی خطا کیا ہے یہی کہ وہ اس ملک میں اللہ و رسولؐ کا نام لیتے ہیں۔ آپ کو وہ لوگ نظر

ہیں۔ نواب کالاباغ کی اس گھرکی پر مسئلہ ختم ہو گیا لیکن اُدھر یہ واقعہ ہے کہ نوابزادہ لیاقت علیخاں چودھری ظفر اللہ کو الگ کرنے کا سوچ رہے تھے اور میرزا محمود کے بعض سیاسی عزائم سے متعلق اُن سے جواب لینا چاہتے تھے کہ راولپنڈی میں ایک شخص سید اکبر کی گولی کا نشانہ ہو کر شہید ہو گئے۔

نواب کالاباغ اس کے بعد میرزائیوں کی نگاہ میں رڑکنے لگے۔ آخر میرزائی اُمت کی سازش کا شکار ہو کر گورنری سے الگ ہو گئے حتیٰ کہ انہیں بھی گولی کھا گئی۔ اس قسم کے شواہد و نظائر موجود ہیں کہ جس نے بھی میرزائی اُمت کا محاسبہ کیا وہ اس کی احتسابی سازش کا شکار ہو گیا۔ ان لوگوں نے ایسے کسی شخص کو معاف نہیں کیا جو ان کے نزدیک قادیانی جماعت کا نکتہ چیں رہا ہو یا کبھی ان کا دوست نہ تھا۔

## آستین کے سانپ

ہندوستان مخلوط تھا اور حکمران انگریز تھے تو میرزائی مسلمانوں میں تبلیغ کا حوصلہ نہ رکھتے تھے۔ وہ مسلمان عوام میں سیاست رچانے سے محروم ہو چکے تھے لیکن پاکستان بنتے ہی وہ سرکش گھوڑے کی طرح ہو گئے انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ اس ملک کی عنان گویا ان کے ہاتھ میں ہو گی۔

شاہ جی نے احرار دوستوں کو جمع کیا اور ان سے مشورہ کے بعد ۱۹۴۹ء کی آخری سہ ماہی میں فیصلہ کیا کہ قادیانیوں کے سیاسی عزائم سے حکومت کو مطلع کرتے رہنا چاہیئے۔ قاضی احسان احمد شجاع آبادی اس غرض سے نامزد کیئے گئے انہوں نے اکابر حکومت کو میرزائیوں کے خط و خال سے آگاہ کرنا شروع کیا۔ جہاں تک میرزائیوں کے خلاف دینی محاذ کا تعلق تھا وہ سارا کام مولانا محمد علی جالندھری اور دوسرے رفقاء کے سپرد کر دیا کہ ان کا تعاقب ہوتا رہے خود بھی گاہے ماہے مختلف شہروں کے جلسہ ہائے عام میں جانے لگے۔ فوری اثر یہ ہوا کہ میرزائی جس رفتار سے بڑھ رہے تھے اس میں کمی آ گئی۔ اِدھر اوکاڑہ میں ایک

احمدی مدرس محمد اشرف اپنی سرکشی کے باعث ایک نوجوان کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ راولپنڈی
باغ گوا لمنڈی میں ایک شخص ولایت خان نے بدر دین احمد کو موت کے گھاٹ اُتار ڈالا۔
قتل انسانی کسی لحاظ سے بھی پسندیدہ فعل نہیں، سزا دینے کا حق حکومت کی عدلیہ کو ہے لیکن
ان حالات کے واحد ذمہ دار میرزا محمود تھے جو کسی روک ٹوک کے بغیر احمدیوں کو قتل و خون کی
دعوت دے رہے تھے ان کا فرمان تھا کہ "جو ہماری فتح کا قائل نہیں ہو گا تو صاف سمجھا جائیگا
کہ اس کو ولد الحرام بننے کا شوق ہے اور حلال زادہ نہیں"۔

(انوار السلام صفحہ ۳)

میرزا محمود قادیان ... افراد کو قتل کرانے کے ماہر سمجھے جاتے تھے اس غرض سے وہ
اپنے والد کی "پیش گوئیاں" اور اپنے ذاتی "الہام" استعمال کرتے۔ مسلمانوں کو کافر، سور اور
ان کی عورتوں کو کتیا کہتے رہے۔ ان کے لئے کوئی روک یا پرسش نہ تھی قادیان میں ایک متوازی
حکومت قائم تھی۔ مولوی عبدالکریم مباہلہ کو وہاں سے نکالا گیا۔ اس کا مکان جلا ڈالا، محمد حسین
کو قتل کروایا جب قاتل پھانسی پا گیا تو اس کا جلوس نکالا اور بہشتی مقبرے میں دفن کرایا۔
یہ چیز پچھلے اوراق میں آ چکی ہے کہ میرزا محمود نے ایک شخص راجندر سنگھ آتش کو
شاہ جی کے قتل پر مامور کیا لیکن وہ ضمیر کی سرزنش پر منحرف ہو گیا۔ ۵ / جنوری ۱۹۵۲ء کے
الفضل میں میرزا محمود نے اعلان کیا کہ:

"آخری وقت آپہنچا ہے ان علمائے حق کے خون کا بدلہ لینے کے لئے جن کو یہ علماء
قتل کراتے آئے ہیں اب ان کے خون کا بدلہ لیا جائے گا۔"

اور وہ زیر عتاب علماء کون تھے۔ میرزا محمود نے ان کے نام بھی درج کیے تھے۔

(۱) سید عطاء اللہ شاہ بخاری
(۲) مُلّا عبدالحامد بدایونی
(۳) مُلّا احتشام الحق تھانوی
(۴) مُلّا (مفتی) محمد شفیع
(۵) مُلّا مودودی

جسٹس منیر اور ان کے مآخذ یعنی سی آئی ڈی کے ارباب بست وکشاد کے اس الزام کی تردید تو اسی اعلان سے ہو جاتی ہے کہ تحریک ختم نبوت احرار احمدی نزاع تھا یا کیا تھا۔ شاہ جی کے سوا باقی چار میں سے کوئی بھی احراری نہ تھا اور نہ کبھی احرار سے وابستہ رہا۔ مولانا عبد الحامد بدایونی، مولانا احتشام الحق تھانوی اور مفتی محمد شفیع شروع ہی سے لیگ میں تھے۔ شاہ جی یا دوسرے زعماء ان تہدیدوں کا نوٹس نہ لیتے تو غلط ہوتا۔ میرزا کی اڑان گھائیوں ہی کا نتیجہ تھا کہ تحریک ختم نبوت کے مطالبات واضح و مدون ہوتے گئے۔

۱۷ مئی ۱۹۵۲ء کو چودھری ظفر اللہ خان نے جہانگیر پارک کراچی میں احمدیوں کے ایک جلسہ عام کو خطاب کیا، خواجہ ناظم الدین نے انہیں منع کیا کہ وہ اس جلسہ میں شریک نہ ہوں لیکن چودھری صاحب نہ مانے اور خواجہ صاحب سے کہا کہ وزیر اعظم اس بات پر مصر ہوں تو وہ اپنے عہدے سے مستعفی ہونے کو تیار ہیں۔

"چودھری صاحب نے جلسہ میں فرمایا کہ:
احمدیت ایک ایسا پودا ہے جو اللہ تعالیٰ نے خود لگایا ہے، وہ اب جڑ پکڑ گیا ہے اگر یہ پودا اکھاڑ دیا گیا تو اسلام ایک زندہ مذہب کی حیثیت سے باقی نہ رہے گا بلکہ ایک سوکھے ہوئے درخت کی مانند ہو جائے گا اور دوسرے مذاہب پر اپنی برتری کا ثبوت مہیا نہ کر سکے گا۔"
(تحقیقاتی رپورٹ اردو متن صفحہ ۷۷)

اس جلسہ کے ردعمل میں فساد ہو گیا نتیجۃً میرزائیوں کی بعض عمارتوں کو نقصان پہنچا۔

## آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن

جب پانی سر سے گزر گیا اور میرزائی منہ زوری کے علاوہ سینہ زوری پر تل گئے تو مولانا لال حسین اختر نے تھیوسوفیکل ہال کراچی میں آل پاکستان مسلم پارٹیز کے مقامی زعماء کی ایک کانفرنس بلوائی۔ جس میں ظفر اللہ خان کے جلسہ سے پیدا شدہ صورتِ حال پر غور کیا گیا اور قادیانی مسئلہ سے متعلق مطالبات مرتب کرنے کے لئے ۲ جون ۱۹۵۲ء کو ایک مجلس مشاورت

طلب کی گئی۔ اس دعوت نامہ پر مولانا احتشام الحق تھانوی، مولانا عبدالحامد بدایونی، مفتی جعفر حسین مجتہد، مولانا محمد یوسف کلکتوی اور مولانا لال حسین اختر کے دستخط تھے۔

ذیل کے مطالبات مرتب کیے گئے۔

(۱) قادیانیوں کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔
(۲) چودھری ظفراللہ خان کو وزیر خارجہ کے عہدے سے سبکدوش کیا جائے۔
(۳) تمام کلیدی عہدوں سے احمدیوں کو ہٹا دیا جائے۔
(۴) ان مقاصد کو قطعی شکل دینے کے لئے آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن منعقد کی جائے۔

علامہ سید سلیمان ندوی نے اس اجلاس کی صدارت کی۔ کنونشن منعقد کرنے کے لئے ایک بورڈ بنایا گیا۔ جلسہ عام میں محولہ مطالبات کی تصدیق کرائی گئی۔ بورڈ کے ارکان حسب ذیل تھے۔

(۱) علامہ سلیمان ندوی
(۲) مفتی محمد شفیع
(۳) مولانا عبدالحامد بدایونی
(۴) علامہ محمد یوسف کلکتوی
(۵) علامہ مفتی صاحب داد صاحب
(۶) علامہ سلطان احمد
(۷) علامہ شاہ احمد نورانی
(۸) مولانا لال حسین اختر
(۹) الحاج ہاشم گزدر
(۱۰) مفتی جعفر حسین مجتہد
(۱۱) مولانا احتشام الحق تھانوی کنوینر مقرر کیے گئے۔

۱۳ر جولائی ۱۹۵۲ء کو الحاج محمد ہاشم گزدر کے مکان پر بورڈ کا اجلاس ہوا، مندرجہ تحت جماعتوں کو کنونشن میں شمول کے لئے دعوت نامے جاری کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

(۱) جمعیۃ العلمائے پاکستان
(۲) جمعیۃ العلمائے اسلام
(۳) جماعت اسلامی
(۴) تنظیم اہل سنت والجماعت
(۵) جمعیۃ اہل سنت
(۶) جمعیۃ اہل حدیث
(۷) موتمر اہل حدیث پنجاب
(۸) ادارہ تحفظ حقوق شیعہ پنجاب

⑨ سفینۃ المسلمین ⑩ حزب اللہ مشرقی پاکستان
⑪ مجلس تحفظ ختم نبوت ⑫ مجلس احرار
⑬ جمعیۃ العربیہ ⑭ جمعیۃ الفلاح

## لاہور کنونشن

شاہ جی صورت حال کے بگاڑ کو پوری طرح جان چکے تھے اور ان کی نگاہ پاکستان میں قادیانی مسئلے کے احوال و وقائع پر تھی۔ انہوں نے رفقاء کو مشورہ دیا کہ وہ خود جا کر ہر مکتب خیال کے علماء کو قادیانی اُمت کے عزائم سے آگاہ کریں پھر اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے جو رائے ان سب کی ہو اس کے مطابق عمل کیا جائے۔[1]

چنانچہ شاہ جی کی حسب ہدایت ۱۳ جولائی ۱۹۵۲ء کو لاہور میں آل مسلم پارٹیز کانفرنس منعقد کی گئی اس کانفرنس کا دعوت نامہ حسب ذیل حضرات کے دستخطوں سے جاری ہوا۔

• مولانا غلام محمد ترنم • مفتی محمد حسن • مولانا احمد علی • مولانا محمد علی جالندھری
• مولانا داؤد غزنوی • مولانا نورالحسن بخاری • سید مظفر علی شمسی • مولانا غلام غوث ہزاروی

شاہ جی تشریف لائے تو پہلی قطار میں ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ کسی نے کہا کہ آپ کے دائیں طرف حضرت پیر سید مہر علی شاہ گولڑہ شریف کے فرزند ارجمند سید غلام محی الدین شاہ تشریف فرما ہیں۔ شاہ جی دفعۃً اُٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے دونو ہاتھ صاحبزادہ صاحب کے پاؤں کی طرف احتراماً بڑھا دیئے لیکن صاحبزادہ صاحب نے روک کر معانقہ کیا۔ اس کانفرنس میں ذیل کے مطالبات طے کئے گئے۔

① میرزائیوں کو مسلمانوں سے الگ اقلیت قرار دیا جائے۔

---

[1] تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ ختم نبوت کے مسئلہ میں سرکاری افسروں کے رویے اور ان کے اہتمام میں خون خرابہ کی جامع دستاویز ہے۔

(۲) چودھری ظفر اللہ خان کو وزارت خارجہ سے سبکدوش کر دیا جائے۔
(۳) میرزائی افسروں کو کلیدی آسامیوں سے الگ کیا جائے۔
(۴) ربوہ کی بقیہ اراضی پر مہاجرین کو آباد کیا جائے۔

برِعظیم کی تاریخ میں غالباً یہ پہلا موقع تھا کہ تمام مکاتیب خیال کے علماء و مشائخ اس طرح اکٹھے ہوئے تھے۔

کراچی میں ۲ا جولائی کو اسی مسئلہ پر غور کرنے کے لئے علماء و مشائخ کا اجتماع ہوا تو لاہور سے مولانا ابوالحسنات قادری، شیخ حسام الدین، ماسٹر تاج الدین انصاری اور مولانا مرتضیٰ احمد میکش شامل ہوئے۔ اس میں فیصلہ کیا گیا کہ ۱۶، ۱۷، ۱۸ جنوری کو کراچی میں کنونشن منعقد کیا جاتے۔ اس دوران میں حکام مجاز نے طرح طرح کے فیصلے کیے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ ان کے دماغ کی غلطیاں تھیں یا دل کی شرارتیں۔ بہر حال تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ میں سرکاری افسروں کے حوالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دوسرے تمام علماء و اکابر کو نظر انداز کر کے اس مسئلہ میں صرف احرار کو مطعون کرنے پر تلے ہوئے تھے اور ان کی کوشش تھی کہ اس کا الزام احرار پر عائد کریں۔ انہوں نے اس سلسلہ میں ایک نہیں کئی غلطیاں کیں۔ دوسرے تمام عناصر جو اس مسئلہ میں پیش پیش تھے اور آخر تک نمایاں و ممتاز رہے ان کی تعداد بہ مقابلہ احرار کسی طرح بھی نوے فیصد سے کم نہ تھی اور یہ وہی لوگ تھے جو کبھی کانگرس یا اس کی ہم خیال جماعت میں نہ رہے تھے اور ہمیشہ مسلم لیگ کا ساتھ دیا تھا ان کے متعلق ہمیشہ یہی فیصلہ کیا گیا کہ انہیں نہ پکڑا جائے لیکن شیخ حسام الدین، ماسٹر تاج الدین انصاری، سید عنایت شاہ بخاری اور صاحبزادہ فیض الحسن شاہ وغیرہ کو پکڑا گیا کہ وہ احرار کے راہنما تھے۔ سرکاری افسر غالباً ربوہ کے مشورہ سے مسئلہ کو احرار احمدی نزاع کا نام دے کر احرار کو ختم کرنے کے منصوبہ کی تیاری میں منہمک تھے۔ اس افسر شاہی کا خمیازہ ۱۸ جولائی ۱۹۵۲ء کو اہل ملتان نے بھگتا کہ تھانہ کپ سے باہر پولیس نے احتجاجی جلوس پر فائرنگ کی۔ تین آدمی شہید اور تیرہ زخمی

ہوئے۔ ان زخمیوں میں سے بھی تین ہسپتال میں دم توڑ گئے۔ حکومت نے ہائی کورٹ کے ایک جج کو انکوائری پر مقرر کیا اس نے پولیس فائرنگ کو جائز قرار دیا۔ اس افسر شاہی کے کا ایک مظہر آغا احمد رضا، ڈپٹی کمشنر ملتان تھا جو ایک بد مزاج قسم کا افسر تھا اُسے ہمیشہ یہ زعم رہا کہ وہ کوئی اعلیٰ مخلوق ہے حالانکہ وہ محض ایک ڈپٹی کمشنر ہی تھا۔

اس المیہ کا مسلمانوں کو بڑا صدمہ تھا کہ ایک تھانیدار نے مسلمانوں کے احتجاج کو اپنے تشدد کا نشانہ بنایا جس سے نوبت گولی تک جا پہنچی۔

اسی دوران میں مسلم لیگ کی مختلف شاخوں نے مندرجہ بالا مطالبات کی تائید کی حتیٰ کہ صوبہ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے بھی اس ضمن میں ایک تائیدی قرارداد پاس کی جس میں میرزائیوں کو اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کیا گیا۔ منیر انکوائری رپورٹ کے مطابق ۶ مارچ ۱۹۵۳ء سے پہلے صوبہ بھر میں ۳۹۰ جلسے ہوئے جن میں ۱۶۷ کا اہتمام مجلس احرار کی شاخوں نے کیا اور ان میں محولا بالا مطالبات کی تائید کی گئی۔

جو علماء کراچی کانفرنس میں شریک ہوئے وہ یہ تھے۔

(۱) مولانا ابوالاعلیٰ مودودی
(۲) سید عطاء اللہ شاہ بخاری
(۳) مولانا ابوالحسنات قادری
(۴) مولانا محمد یوسف بجنوری
(۵) مولانا احمد علی لاہوری
(۶) مولانا ابراہیم میر سیالکوٹ
(۷) مولانا شمس الحق وزیر معارف قلات
(۸) خلیفہ حاجی ترنگ زئی پشاور
(۹) پیر سر سینہ شریف ڈھاکہ
(۱۰) مولانا راغب احسن ایم اے ڈھاکہ
(۱۱) مولانا اطہر علی ڈھاکہ
(۱۲) مولانا سخاوت الانبیاء ڈھاکہ
(۱۳) مولانا حاجی محمد امین امیر جماعت ناجیہ
(۱۴) مولانا عزیز الرحمٰن ناظم حزب اللہ ڈھاکہ
(۱۵) مفتی محمد حسن جامعہ اشرفیہ لاہور
(۱۶) مولانا محمد ادریس کاندھلوی
(۱۷) مولانا ظفر احمد عثمانی
(۱۸) علامہ سید سلیمان ندوی

231

(۱۹) مفتی محمد شفیع دیوبندی

(۲۰) مولانا سلطان احمد امیر جماعت اسلامی کراچی

(۲۱) مولانا مفتی صاحب داد خانصاحب سندھ مدرسہ کراچی

(۲۲) مولانا عبدالحامد بدایونی

(۲۳) مولانا محمد یوسف کلکتوی

(۲۴) مولانا محمد اسماعیل گوجرانوالہ

(۲۵) مولانا سید محمد داود غزنوی

(۲۶) مولانا محمد علی جالندھری

(۲۷) مولانا احتشام الحق تھانوی۔

حسب ذیل قراردادیں منظور کی گئیں۔

(۱) چونکہ خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم پاکستان کے رویئے کے پیش نظر اس امر کی کوئی اُمید نہیں کہ میرزائیوں کے متعلق مطالبات تسلیم کر لئے جائیں گے اس لئے آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ ان حالات میں مطالبات کو تسلیم کرانے کے لئے "راست اقدام" ناگزیر ہو گیا ہے۔

(۲) چونکہ حکومت میرزائیوں کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دینے پر آمادہ نہیں اس لئے ایسی تدابیر اختیار کرنا لازم ہو گیا ہے کہ فرقہ میرزائیہ کو ملت اسلامیہ سے خارج کر دیا جائے ان تدابیر میں سے ایک یہ ہے کہ اس فرقے کا کامل مقاطعہ کیا جائے۔

(۳) چونکہ میرزائی وزیر خارجہ چودھری ظفر اللہ خان کی برطرفی کا مطالبہ اب تک منظور نہیں کیا گیا اس لئے کنونشن خواجہ ناظم الدین سے استعفیٰ کا مطالبہ کرتی ہے تاکہ مسلمانان پاکستان اپنے دینی عقائد پر عمل کرنے اور اسلامی روایات کی حفاظت کرنے کے قابل ہو جائیں۔

(۴) مذکورہ بالا مطالبات کو عملی صورت دینے کی غرض سے کنونشن تجویز کرتی ہے کہ وہ معزز و مقتدر مسلمانوں اور مختلف مذہبی جماعتوں کے نمائندوں کو جنرل کونسل کا ممبر بنائے۔

(۵) جنرل کونسل اپنے پندرہ ممبروں کو منتخب کرے جو مجلس عمل کے ممبر قرار پائیں۔

جنرل کونسل مندرجہ ذیل آٹھ اصحاب کو مجلس عمل کا ممبر منتخب کرتی ہے۔

(۱) مولانا سید ابوالحسنات قادری

(۲) امیر شریعت۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری

(۳) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی — (۴) مولانا عبدالحامد بدایونی

(۵) حافظ کفایت حسین — (۶) مولانا احتشام الحق تھانوی

(۷) ابوالصالح محمد جعفر پیر صاحب سرسینہ شریف مشرقی پاکستان

(۸) مولانا محمد یوسف کلکتوی۔

اور ان ممبروں کو اختیار دیتی ہے کہ بقیہ سات ممبروں کو اپنی مرضی سے نامزد کریں۔

(۶) مجلس عمل کو اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ مطالبات کو منظور کرانے کے لئے لائحہ عمل مرتب کرے۔

(۷) مجلس عمل کو ہدایت دی جاتی ہے کہ کوئی عملی پروگرام اختیار کرنے سے پیشتر ایک نمائندہ وفد مرتب کرے جو مرکزی حکومت سے ملاقات کر کے اس کو لوگوں کے آخری فیصلے سے مطلع کر دے۔ اس وفد کو اختیار ہوگا کہ کابینہ کو آخری جواب کے لئے مزید وقت دیدے۔

اسی دن نماز مغرب کے بعد مجلس عمل کے آٹھ ممبروں کا اجلاس ہوا اور مندرجہ ذیل سات ممبروں کو شامل کیا گیا۔

(۱) پیر غلام مجدد سرہندی — (۲) مولانا نورالحسن

(۳) ماسٹر تاج الدین انصاری — (۴) مولانا اختر علی خان

(۵) مولانا محمد اسماعیل گوجرانوالوی — (۶) صاحبزادہ فیض الحسن شاہ

(۷) حاجی محمد امین سرحدی۔

اس اجلاس میں مجلس عمل نے ایک وفد مرتب کیا جو خواجہ ناظم الدین سے ملاقات کرے چنانچہ ایک وفد جس کے رئیس مولانا عبدالحامد بدایونی اور جس کے شرکاء (۱) پیر صاحب سرسینہ شریف (۲) سید مظفر علی شمسی سیکرٹری ادارہ تحفظ حقوق شیعہ لاہور (۳) ماسٹر تاج الدین انصاری صدر مجلس احرار تھے۔

وفد ۲۲ جنوری ۱۹۵۳ء کو خواجہ ناظم الدین سے ملاقی ہوا۔ خواجہ صاحب نے مطالبات

نے اجلاس کی صدارت کی اور فیصلہ کیا کہ راست اقدام کی شکل کیا ہو۔ پانچ رضاکار مطالبات کے جھنڈے اُٹھا کر وزیر اعظم کی کوٹھی پر جائیں اور پُر امن رہ کر لگاتار مظاہرہ کریں اسی قسم کا مظاہرہ گورنر جنرل کی کوٹھی پر جاری رہے۔ مولانا ابو الحسنات کو پہلا ڈکٹیٹر مقرر کیا گیا اور عوام سے اپیل کی گئی کہ وہ رضاکاروں کے ساتھ مطلقاً نہ جائیں۔

حکومت نے ۲۶ اور ۲۷ فروری کی درمیانی رات ــــ سید عطاء اللہ شاہ بخاری، اور ان کے رفقاء کو گرفتار کر لیا اور پنجاب میں احرار کے متعلقین کو پکڑ کے جیلوں میں ڈال دیا۔ اس جانبدارانہ تشدد سے لوگ بر افروختہ ہو گئے اور صوبہ بھر میں برہمی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ لاہور، سیالکوٹ، گوجرانوالہ، راولپنڈی، لائل پور اور منٹگمری میں لوگوں نے اس شدت سے احتجاج کیا کہ لاء اینڈ آرڈر کی آبرو اُٹھ گئی اور قریب قریب نظام حکومت معطل ہو گیا۔ لاہور کے احتجاجی مظاہرے قابو سے اس قدر باہر ہو گئے کہ چھ مارچ کو شہر فوج کے حوالے کر دیا گیا۔ جو کچھ لاہور میں ہوا راقم اس کا چشم دید گواہ ہے۔

(۱) اس میں کوئی شک نہیں کہ احتجاجی جلوس ہزارہا لوگوں پر مشتمل ہوتے اور مرزائیوں کے خلاف پُرجوش نعرے بلند کئے جاتے تھے لیکن عام جلوس دہلی دروازے سے شروع ہو کر چیرنگ کراس پر ختم ہو جاتے کسی مرحلے میں بھی اہلِ جلوس کی طرف سے کوئی سی بدنظمی کا ارتکاب نہ ہوا۔

(۲) ان پُرامن مظاہروں کا خاتمہ مشکل تھا۔ انتظامیہ کے پاس ایسا کوئی قانون نہ تھا جس سے وہ مظاہرے ختم کر سکتی۔ راقم سے خود ایک سپرنٹنڈنٹ پولیس نے بیان کیا کہ ہر روز کے اس جلوس کو ختم کرنے کے لئے وہ تشدد کی طرح ڈال کر قضیہ نمٹا دیں گے۔

(۳) چنانچہ حکام نے اپنے سفید پوش اہلکاروں کی معرفت پولیس پہ پتھراؤ کیا اور اس طرح فائرنگ کی بنیاد رکھی۔

(۴) شہر کے مختلف حصوں میں پولیس اور عوام میں تصادم شروع ہو گیا۔ نتیجۃً سید فردوس شاہ

(۴) شہر کے مختلف حصوں میں پولیس اور عوام میں تصادم شروع ہو گیا۔ نیتجتہً سید فردوس شاہ



ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کو لوگوں نے مار ڈالا۔ مرحوم کے خلاف یہ الزام تھا کہ اس نے چوک داالگراں میں مظاہرین کو بُری طرح مارا اور قرآن مجید کی توہین کی تھی۔ مسجد وزیر خان کے پاس ایک ہجوم نے اسے گھیر لیا پھر چھروں اور لاٹھیوں سے حملہ کر کے وہیں ہلاک کر دیا۔ سید فردوس شاہ کے جسم پر زخموں کے ۵۲ نشان تھے۔

(۵) کئی جگہ قادیانی جیپ میں سوار ہو کر فائرنگ کرتے رہے لیکن انہیں روکنے اور ٹوکنے والا کوئی نہ تھا بعض قادیانی العقیدہ پولیس افسروں نے اپنے علاقہ میں مسلمان نوجوانوں کو بے دریغ شہید کیا۔

(۶) اس وحشیانہ تشدد کے ہاتھوں تنگ آکر مسلمانوں نے مسجد وزیر خان میں کیمپ لگا لیا اور پولیس کی رپورٹوں کے مطابق ایک متوازی حکومت قائم کی اس کیمپ کے انچارج مولانا عبدالستار خان نیازی تھے۔

(۷) لاہور میں مال روڈ پر چینیز لنچ ہوم کے سامنے کلمہ طیبہ پڑھتے ہوئے ۱۵ سے ۲۲ سال کی عمر کے نوجوانوں کی ایک جماعت پر ملک حبیب اللہ سپرنٹنڈنٹ سی آئی ڈی نے گولیوں کی بوچھاڑ کرائی اور دس بارہ بے گناہ نوجوانوں کو شہید کروا ڈالا۔ یہ نظارہ انتہائی دردناک تھا۔

(۸) لاہور چھاؤنی کے ملٹری ہسپتال میں بہت سے مظاہرین جو فوج کی گولی سے مجروح ہوئے تھے انتہائی استقامت سے پڑے تھے ان میں سے ایک نوجوان نے ہوش میں آتے ہی اپنے کرنل ڈاکٹر سے سوال کیا اس کے چہرے پر کسی خوف کے آثار تو نہیں ہیں؟ جب اسے کہا گیا کہ ایسا نہیں ہے تو اس کا چہرہ فخر و مسرت سے تمتما اٹھا۔

(۹) ۶ مارچ کو مارشل لاء نافذ کر کے سارا شہر فوج کی نذر کر دیا۔ فوج نے اپنی ہی قوم

(۱۰) مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا عبدالستار خان نیازی کو ملٹری کورٹ نے موت کی سزائیں دیں اور ان دونوں حضرات نے پھانسی کی کوٹھری میں جس بے نظیر استقامت و ایمان کا مظاہرہ کیا وہ حیرت انگیز تھا۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنے لڑکے سے کہا کہ اس حکومت سے کوئی اپیل نہ کرنا پھانسی پاجاؤں تو انہی کپڑوں میں دفنا دینا۔ مولانا سے چند قدم آگے مولانا عبدالستار خان نیازی پھانسی کی کوٹھری میں بند تھے وہ ان کے ملاقاتیوں کو للکارتے اور کہتے کہ اس بزدل حکومت میں یہ جرأت نہیں کہ مجھے پھانسی پر لٹکا سکے۔ بھلا مولانا کو پھانسی پر کیونکہ لٹکا سکتی ہے۔ وہ کسی حالت میں بھی مولانا کو پھانسی پر لٹکانے کا خطرہ مول نہیں لے گی وہ اپنی موت سے ڈرتی ہے۔

(۱۱) اول "پولیس" ثانیاً "مارشل لا"۔ ان دونوں کے ہاتھوں لاہور کے مسلمانوں کی جو بے عزتی کی گئی وہ تشدد و بہیمیت کا ایک ایسا سانحہ تھا کہ اس سے پہلے کسی نے ۴۰ برس میں ایسا اندوہناک ڈرامہ نہیں دیکھا تھا۔

(۱۲) انگریزوں کے زمانہ میں لاہور کا شاہی قلعہ سیاسی اسیروں کے خلاف استعمال ہوتا تھا اس تحریک میں بھی کئی علماء کو گرفتار کر کے قلعہ میں لے جایا گیا وہاں ایک ایسے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کو ان سے استفسار پر لگایا گیا جو انگریزوں کے زمانہ سے جھوٹے سیاسی مقدمے بنانے میں ماہر تھا اور جس کو اپنے طرزِ استبداد پر ہمیشہ ناز رہا۔

اس نے ان علماء کے خلاف اس قسم کی واہیات زبان استعمال کی کہ ایک شریف آدمی تخلیہ میں بھی اس کا تصور نہیں کر سکتا۔ مثلاً اس نے بعض خوبصورت لڑکے کوٹھڑیوں میں ان کے ساتھ ڈال دیئے اور استہزاءً ان سے کہا کہ امیر شریعت کی سنت تازہ کرو۔

شاہ جی اور ان کے ساتھیوں مولانا سید ابوالحسنات، ماسٹر تاج الدین انصاری مولانا لال حسین اختر، صاحبزادہ فیض الحسن اور سید مظفر علی شمسی وغیرہ کو گرفتار کر کے پہلے کراچی جیل میں رکھا پھر سکھر جیل بھجوا دیا جہاں ان کے لئے خاصی پریشانی پیدا کی گئی۔

ادھر حکومت پاکستان کا ایک اعلیٰ افسر سکھر جیل گیا اور ان سے کہا کہ مسلمانوں کی حکومت ہے ایک اسلامی سلطنت میں اس قسم کی تحریکیں چلانا مناسب نہیں۔ چار سطریں لکھئے اور گھر جائیے۔ شاہ جی نے جواب دیا میں جانتا ہوں کہ مسلمانوں کی حکومت ہے اور پاکستان ایک اسلامی سلطنت ہے مگر ــــــ ع

سبو اپنا اپنا ہے جام اپنا اپنا

مسلمانوں کی ساری تاریخ یہی ہے کہ چند لوگ حکمرانی کرتے اور کچھ لوگ ان کے ہاتھوں قید و بند میں رہتے ہیں بھلا اس کے بغیر کوئی سی اسلامی حکومت کیونکر مکمل ہوتی ہے؟ اس ساری صورتِ حال سے اگر کوئی شخص خوش تھا تو وہ صرف ربوہ کا خلیفہ میرزا محمود تھا یا اس کی جماعت جس نے بعض پولیس افسروں کو ہر قسمی آب و دانہ مہیا کر رکھا تھا۔

شاہ جی کے مرض الموت کا آغاز سکھر جیل ہی سے ہوا اچانک معلوم ہوا کہ ان کا جسم کئی بیماریوں کا محور ہو گیا ہے۔

لاہور میں یکم جولائی ۱۹۵۳ء کو تحقیقاتی کمیٹی نے کام شروع کیا تو کمیٹی کے سامنے جوابدہ فریقوں میں احرار زعماء کو بھی شامل کیا گیا۔ اس غرض سے ۲۵ جولائی ۱۹۵۳ء کو شاہ جی اور ان کے تمام ساتھی لاہور سنٹرل جیل میں منتقل کر دیئے گئے۔

شاہ جی اس کمیٹی سے تعاون کے حق میں نہ تھے۔ راقم کا ذاتی تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ وہ اکثر نازک مرحلوں میں استدلال کے بجائے وجدان سے باتیں کرتے اور عموماً ایسی باتیں کہہ جاتے جو بظاہر عجیب سی معلوم ہوتیں لیکن جب نتائج سامنے آتے تو انہی کے مطابق ہوتے۔ شاہ جی کو اصرار تھا کہ "تحقیقاتی کمیٹی جسٹس منیر کی وجہ سے کبھی صحیح نتائج مرتب نہ کر سکے گی۔ میں ذاتی طور پر منیر کو جانتا ہوں وہ احرار کا دشمن اور احمدیوں کا دوست ہے اس کی ضرورتیں احمدی بکمال و تمام پوری کر سکتے ہیں بہتر ہے کہ ہم اس فتنہ کا ساتھ نہ دیں اور جو شخص عاقبت خراب کرنے پہ تلا ہوا اس کو عاقبت خراب کرنے

دیں۔ منیر دنیادار انسان ہے وہ آخرت کو نہیں مانتا اور نہ اس کو توحید و رسالت سے آگاہی و ارادت ہے۔ شاہ جی کے رفقا نے ان کی بات نہ مانی اور تحقیقاتی کیمٹی سے تعاون کا فیصلہ کر لیا۔

اس کیمٹی کے اجلاسوں میں جو کچھ ہوا وہ غایت درجہ افسوسناک ہے۔ جسٹس منیر علمار کی اہانت پر تُلے ہوئے تھے انہوں نے اپنے اختیارات سے تجاوز کر کے علمار اور اسلام کو اپنی ژاژ خائی کا ہدف بنایا۔ یکم جولائی ۱۹۵۳ء سے لے کر ۲۳ جنوری ۱۹۵۴ء تک اس کمیٹی کے ۱۱۷ اجلاس ہوئے جن میں ۹۲ اجلاس شہادتوں کی سماعت اور ان کے اندراج میں صرف ہوئے۔ یکم فروری سے ۲۸ فروری ۱۹۵۴ء تک طرفین میں بحث ہوتی رہی اس کے بعد ۱۰ اپریل ۱۹۵۴ء کو کمیٹی نے اپنی رپورٹ حکومت پنجاب کو پیش کر دی۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ احرار کے عدم تعاون سے کمیٹی کیا کرتی اور نتیجہ کیا ہوتا لیکن تعاون کا نتیجہ یہ تھا کہ جسٹس منیر نے کھلے اجلاسوں میں علمار کا صد درجہ استخفاف کیا۔ افسوس کہ علمار نے برداشت کیا اگر کوئی دیوانہ جسٹس منیر کو ٹوک دیتا تو لازماً کمیٹی کو علمار کی اہانت کرنے کے شوق سے دست بردار ہونا پڑتا۔

ان دنوں راقم نے اپنے جریدے میں ایک شذرہ لکھا "مُلا کو گالی نہ دو"۔ اصلاً یہ خلیفہ عبدالحکیم کے اس مقالہ کا جواب تھا جو انہوں نے "مُلا اور اقبال" کے عنوان سے لکھا اور اس میں علمار کو بزعم خویش رسوا کرنا چاہا تھا۔ اس شذرہ کو دیکھتے جسٹس منیر نے راقم کو عدالت میں طلب کر لیا" فوراً" گرفتار کر کے پیش کرو" کے تحت راقم سہ پہر کے اجلاس میں خود ہی پیش ہو گیا۔ جسٹس منیر ہوا کے گھوڑے پر سوار تھے۔

وہ ۔ یہ شذرہ آپ نے لکھا ہے؟

میں ۔ جی ہاں۔

وہ ۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ہم اس کو سمجھتے نہیں۔

میں ۔ ضرور سمجھتے ہوں گے۔

وہ ۔ یہ عدالت کی توہین ہے ۔

میں ۔ عدالت کی توہین کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔

وہ ۔ اس کے بین السطور میں عدالت پر تنقید کی گئی ہے ۔

میں ۔ معاف کیجئے اسلام سب جوڈس (Subjudice) نہیں ہوگیا۔ میں نے اسلام کا دفاع کیا ہے اور اگر اسلام کا دفاع کرنا جرم ہے تو مجھے اپنے جرم کا اقرار ہے۔

جسٹس کیانی ۔ علماء کا مذاق کہاں اُڑایا جاتا ہے ؟

میں ۔ کافی ہاؤس جیسے نشر دیے خانوں میں

جسٹس کیانی ۔ لوگ کیا کہتے ہیں ؟

میں ۔ میں ان کی خرافات کو یہاں بیان کرنا نہیں چاہتا نقل کیا تو اس عدالتِ عالیہ کے حُسن سماعت میں خراش پیدا ہو گی۔

جسٹس کیانی ۔ آپ کافی ہاؤس میں روز و شب کے بیٹھنے والوں میں سے ہیں ۔

میں ۔ جی نہیں ، صبح و شام کے بیٹھنے والوں میں سے ہوں ، رات کو کافی ہاؤس بند ہو جاتا ہے۔

جسٹس منیر جس تیزی سے بول رہے تھے مدھم ہو گئے اور اگلی تاریخ ڈال دی پھر چھوڑ دیا۔

پنجاب میں اتنا خون خرابہ ہو چکا تھا کہ جب تک لوگوں کے دل راضی نہ ہوں کسی حکومت کے لئے بھی کام کرنا مشکل تھا ۔ ایک اندازے کے مطابق تحریک میں کوئی ایک ہزار افراد شہید ہوئے ، مجروحین کی تعداد اس سے بھی زیادہ تھی ۔ ہر گھر حکومت سے بد دل تھا ۔ اولاً میاں ممتاز دولتانہ کی وزارت عظمیٰ برخاست کی گئی اور ملک فیروز خان نون کو صوبہ کا وزیر اعلیٰ بنایا گیا ۔ انہوں نے تقریباً سبھی قیدیوں کو رہا کر دیا ۔ اُدھر مرکزی حکومت میں مرزائیوں

کی ملی بھگت سے سازش کا ایک چکر شروع ہو گیا۔ ملک غلام محمد نے قومی اسمبلی کو برخاست کر دیا۔ خواجہ ناظم الدین وزارت عظمیٰ سے نکال دیئے گئے۔ ان کی جگہ امریکہ میں پاکستان کے سفیر مسٹر محمد علی بوگرا کو درآمد کیا گیا اور وزیر اعظم بنا ئے گئے۔ مولوی تمیز الدین سپیکر نیشنل اسمبلی نے برخاستگی کے خلاف رٹ کی لیکن جسٹس منیر نے یہاں بھی گل کھلایا اور ملک غلام محمد کے اقدام کو جائز قرار دے کر ایک غیر قانونی اقدام کی تصدیق کر دی۔ اس فیصلہ سے ملک میں عدالتی وقار مجروح ہو گیا اس کے ذمہ دار صرف جسٹس منیر تھے۔

## رٹ اور رہائی

مسٹر محمود علی قصوری نے حضرت شاہ صاحب، مولانا ابو الحسنات، صاحبزادہ فیض الحسن اور ماسٹر تاج الدین انصاری کی نظر بندی کے خلاف رٹ دائر کر دی۔

جسٹس ایس اے رحمٰن نے قانونی غلطی کا فائدہ دے کر ۸ فروری ۱۹۵۴ء کو انہیں رہا کر دیا۔ نتیجۃً حضرت شاہ صاحب اور ان کے محولا بالا ساتھی ۸ فروری ۱۹۵۴ء کو لاہور سنٹرل جیل سے رہا ہو گئے۔

رہائی کے فوراً بعد شاہ جی نے ملتان میں ایک استقبالیہ کو خطاب کیا۔ عمر بھر کی روایت کے خلاف آغاز تقریر میں خطبہ مسنونہ کی تلاوت نہ کی۔ لوگ ششدر رہ گئے۔ فرمایا لیڈیز اینڈ جینٹلمین! مجمع کھلکھلا اٹھا، کسی نے کہا،

شاہ جی یہ کیا؟

فرمایا کچھ نہیں، قرآن اس لئے نہیں پڑھوں گا مبادا جسٹس منیر توہین عدالت میں بلوا لیں۔ رہا لیڈیز اینڈ جینٹلمین، تو جسٹس منیر نے انکوائری رپورٹ میں لکھ دیا ہے کہ مسلمان کی کوئی تعریف نہیں اب یہ ملک مسلمانوں اور مسلمات کا نہیں لیڈیز اینڈ جینٹلمین کا ہے"

اسی سال (۱۳ ستمبر) حضرت شاہ صاحب کو ملتان کے ایک اجلاس میں مجلس ختم نبوت

کا صدر منتخب کیا گیا۔ ۱۶ نومبر کو گھر میں وضو کر رہے تھے کہ دائیں جانب فالج کا ہلکا سا حملہ ہوا لیکن جلد ہی اس کا اثر زائل ہو گیا۔ یہ گویا مہلک مرض کے آغاز کا انتباہ تھا۔ لاہور میں شاہ جی نے تقریر کرتے ہوئے اعلان کیا کہ:

جو لوگ تحریک ختمِ نبوت میں جہاں تہاں شہید ہوئے ہیں ان کے خون کا جوابدہ میں ہوں۔ وہ عشقِ رسالت صلعم میں مارے گئے اللہ تعالیٰ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ ان میں جذبۂ شہادت میں نے پھونکا تھا جو لوگ ان کے خون سے دامن بچانا چاہتے اور ہمارے ساتھ رہ کر اب کنی کترا رہے ہیں ان سے کہتا ہوں کہ حشر کے دن بھی اس خون کا ذمہ دار میں ہونگا۔ اگر ان دانشوران بے دین یا دینداران بے عشق کے نزدیک ان کا جان دینا غلطی تھا تو اس غلطی کا ذمہ دار بھی میں ہوں۔ وہ عشقِ نبوت میں اسلامی سلطنت کے ہلاکو خانوں کی بھینٹ ہو گئے حضرت ابو بکر رضؓ نے بھی تو سات ہزار حافظ قرآن صحابہ کو ختم نبوتؐ کی خاطر شہید کرایا تھا۔

شاہ جی کی طبیعت ماندہ ہو چکی تھی لیکن بعض لیڈروں کی دغا اور کراچی کے بعض علماء کی مجزی سے انہیں اتنا صدمہ پہنچا تھا کہ شب و روز دورہ کرتے اور مسلمانوں کو بتاتے کہ ختمِ نبوت کا مسئلہ جوں کا توں ہے اور وہ آخری سانس تک اس کا اعلان کرتے رہیں گے۔

حکومت نے ۱۹۵۵ء میں چھ ماہ کے لئے انہیں اپنے گھر ملتان میں نظر بند کر دیا آزاد ہوئے تو کچھ عرصہ بعد ۱۴ اپریل ۱۹۵۶ء کو خانیوال کی ایک تقریر میں پکڑ لیا۔ کوئی پانچ چھ ماہ مقدمہ چلتا رہا۔ ڈاکٹر خان صاحب صوبہ کے وزیر اعلیٰ تھے، راقم کی استدعا پر انہوں نے مقدمہ واپس لے لیا۔ میرزائیوں نے اس کے خلاف اندر خانہ احتجاج کیا اور اسکندر میرزا سے بات پہنچے۔ اسکندر میرزا نے شاہ جی سے ملاقات کی خواہش کی۔ شاہ جی ٹال گئے کہ فقیر بادشاہوں سے نہیں ملا کرتے۔ سید مظفر علی شمسی نے کوشش کی کہ اسکندر میرزا اسپیشل ٹرین میں ملتان سے گزر رہے ہیں وہاں شاہ جی سے میرزا صاحب کی ملاقات ہو جائے لیکن شمسی صاحب

کو بھی ٹال دیا کہ میں اِن ملاقاتوں کا آدمی نہیں ہوں ۔ اسی دن خبر آگئی کہ ڈاکٹر خان صاحب کو لاہور میں قتل کر دیا گیا ہے ۔ اواخر ۱۹۵۶ء میں جسمانی عوارض یکایک عود کر آئے ایسے پرچت ہوئے کہ پھر صحت ایک گرتی ہوئی دیوار ہو گئی ، کبھی برائے نام صحت کبھی سنگین علالت چار سال یہی عالم رہا ۔ ۱۶ مارچ ۱۹۶۱ء کو فالج کا شدید حملہ ہوا جو ۲۱ اگست کی شام کو چھ بج کر ۵۵ منٹ پر ملک کے اس عظیم انسان کی وفات پر ختم ہو گیا اور اس طرح تحریک ختم نبوت کا سپہ سالار ۴۲ برس کی لازوال جدوجہد کے بعد اس عارضی کائنات سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا۔

---

# احرار کی تحریکیں

احرار راہنما آل انڈیا سیادت کے نہیں آل انڈیا شہرت کے مالک تھے۔ ان کی سیاسی زندگی کا آغاز تحریک خلافت سے ہوا۔ کوئی دس سال بعد مولانا ابو الکلام آزادؒ کے مشورہ سے مجلس احرار اسلام کی بنیاد رکھی گئی اور یہ نام مولانا آزادؒ ہی کا تجویز کردہ تھا۔ پہلا اجلاس لاہور کانگرس کے موقعہ پر ۲۹ دسمبر ۱۹۲۹ء کو اسی کے پنڈال میں ہوا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری صدر منتخب ہوئے۔ لیکن ۱۹۳۰ء شروع ہوتے ہی مہاتما گاندھی نے نمکین ستیہ گرہ کا آغاز کیا تو احرار راہنما اس میں شامل ہو گئے۔ اور تنظیم کی تاسیس کا سفر ملتوی ہو گیا۔ پھر جولائی ۱۹۳۱ء میں گاندھی اِرون میثاق کے تحت تمام سیاسی قیدی چھوٹ گئے تو احرار راہنماؤں نے رہا ہو کر اپنے الگ سفر کی نیو اٹھائی پہلی احرار کانفرنس اسلامیہ کالج لاہور کے حبیبیہ ہال میں مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے زیرِ صدارت منعقد ہوئی ان دنوں جداگانہ اور مخلوط انتخاب کا مسئلہ حقیقتہً دو قومی مسئلہ کا سر آغاز تھا۔ مسلمان جداگانہ انتخاب چاہتے تھے کانگرس مخلوط انتخاب کی حامی تھی۔ یہ سارا قضیہ نہرو رپورٹ سے پیدا ہوا تھا۔ احرار نے اس کانفرنس میں نشستوں کے تعین اور جداگانہ انتخاب کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ اس لحاظ سے کانگرس سے الگ ان کا پہلا سفر تھا۔

احرار کے سامنے کچھ اور واقعات بھی تھے مثلاً:

(۱۳) برعظیم کی تقسیم کے مرحلے میں خدمتِ عوام ۔

" قادیانی جماعت " کی مزاحمت احرار کا مستقل مشن ہوگیا اس کی مزاحمت میں اس کے راہنما وقتاً فوقتاً پکڑے گئے۔ اس ذہن ہی کا نتیجہ تھا کہ پاکستان بنا تو تحریک ختم نبوت کو وہ جوش و جذبہ حاصل ہوا جس کا اجمالی ذکر پچھلے باب میں آچکا ہے مجلس احرار ہندوستان میں واحد جماعت تھی جس نے میرزائی اُمت کے سیاسی عزائم کو بے نقاب کیا اور ان کے منصوبوں کو خاک میں ملا یا اگر اس وقت احرار میرزائیوں کا محاسبہ نہ کرتے اور ان کی مساعی مشکور سے علامہ اقبال آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی صدارت سے الگ نہ ہوتے اور اپنا تاریخی بیان جاری نہ کرتے تو میرزائی پنجاب کی تقدیر پر قابض ہو کر ہندوستان کی سیاسی تاریخ کا رُخ بدل ڈالتے ۔ احرار نے مسلمانوں کو نہایت شرح و بسط سے آگاہ کیا کہ میرزائی اس ملک میں برطانوی استعمار کا ففتھ کالم ہیں۔ اور ان کا وجود مسلمانوں کی دینی وحدت توڑ کر عالمی سامراج کے لئے ایک الگ اُمت پیدا کرنا ہے تاکہ وہ مسلمانوں کے روپ میں دنیائے اسلام کو اُلٹ سکیں۔

## مغل پورہ انجینئرنگ کالج

مغل پورہ انجینئرنگ کالج کا مسئلہ دو ایک دن ہی میں حل ہوگیا۔ مسئلہ صرف اتنا تھا کہ اس کالج کے انگریز پرنسپل مسٹر وہٹکر نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق ایک آدھ توہین آمیز جملہ کہہ دیا تھا۔ مسلمان طلبہ نے ہڑتال کر دی۔ معاملہ پبلک میں آگیا۔ شاہ جی نے موچی دروازہ کے باہر جلسہ عام کو خطاب کیا۔ ان کی تقریر نماز فجر تک جاری رہی۔ سحر کا حال یہ تھا کہ شاہ جی نے اسی وقت جلسہ کو اُٹھا کر مغل پورہ روانہ کر دیا اور وہاں ہزارہا لوگوں نے کالج کا محاصرہ کر لیا پولیس نے لاٹھی چارج کیا جس سے بیسیوں نوجوان زخمی ہوگئے۔ لیکن اسی شام مولانا ظفر علی خان کی مداخلت سے پرنسپل وہٹکر نے معافی مانگ لی اور اس طرح یہ قضیہ ختم ہوگیا۔

## تحریک کپور تھلہ

کپور تھلہ ایجی ٹیشن (۱۹۳۳ء) کسانوں کی زبوں حالی اور مسلمانوں کی درماندگی کے خلاف

دیکھنا گیا۔ کے رہنماؤں نے بعض فلوتیاں رانے سے کہا کہ ہم نے اللہ بخش وزارت سے لڑنے
کے لیئے یہ مسئلہ اُٹھایا ہے ورنہ ہمارا مطمعِ نظر حصول مسجد نہیں ہے۔

سکھر میں مجلس احرار ایک... مضبوط جماعت تھی۔ جب لیگ کے بزرجمہروں نے تحریک
شروع کی تو احرار نے شہید گنج کے سے خطرے کو محسوس کرتے ہوئے ہمنوائی کی۔ مقامی
طور پر چار سو احرار رضاکاروں کو گرفتار کیا گیا۔ احرار کا مسلک... یہ تھا کہ مسجد منزل گاہ کو ہندوؤں
سے مفاہمت کے ساتھ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن لیگ کا مشن دوسرا تھا۔ جب اللہ بخش
شہید کروا دیئے گئے اور سندھ میں لیگ... کا راج قائم ہوا تو منزل گاہ کا مسئلہ اسی طرح
لاینحل رہا۔ آخر احرار کی مساعی سے منزل گاہ واگذار ہو گئی اور دونوں قوموں میں باہمی
سمجھوتہ ہو گیا۔

## خدمتِ خلق

احرار کے نصب العین میں خدمتِ عامہ کا پروگرام بھی تھا۔ کوئٹہ میں زلزلہ آیا تو احرار
نے لاہور میں کیمپ لگا کر اجڑے پچھڑے لوگوں کی بے نظیر اعانت کی۔ جس کا سرکاری حلقوں میں
بھی اعتراف کیا گیا۔ بہار (۱۹۴۶ء) میں مسلمانوں کا قتلِ عام ہوا اور وہاں کے غریب
مسلمانوں کو پاکستان کی ہولناک سزا بھگتنی پڑی تو لیگ کے راہنما پٹنہ جا کر بھی ان کی مدد نہ
کر سکے۔ قتلِ عام کئی اضلاع میں پھیلا ہوا تھا اور غارت زدگی کے آثار و مظاہر انتہائی
لرزہ خیز تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی ہدایت پر احرار نے تین قافلے بھیجے۔ پہلا قافلہ خازی
محمد حسین سالار پنجاب کی قیادت میں، دوسرا امداد کی رقم اور پارچات سے کر راقم تحریر کے
ساتھ، تیسرا سید مخدوم شاہ بنوری کے ہمراہ۔ راقم الحروف نے وہاں ڈیڑھ ماہ رہ کر ایک
طویل رپورٹ مرتب کی اور دہلی لوٹ کر مولانا ابوالکلام آزاد کی خدمت میں پیش کی۔ اس کی
ایک نقل مولانا غلام رسول مہر ایڈیٹر انقلاب کو دی۔ ان دنوں حضرت شاہ عبدالقادر
رائے پوری لاہور میں تھے انہیں ساری روداد عرض کی۔ مہاتما گاندھی اور خان عبدالغفار

بتایا گیا کہ لکھنؤ میں مدح صحابہ ممنوع ہے، یہ تھا مدح صحابہ کے قضیہ میں احرار کا شمول۔
معلوم ہوا کہ ۱۹۰۴ء تک لکھنؤ میں شیعہ سنی قضیہ نہ تھا مگر اس سال ایک شیعہ مقبول احمد نے فتنہ جگایا نتیجتہً دو کربلا ہیں ہوگئیں۔ شیعہ کربلا کا نام تال کٹورہ تھا۔ سنیوں نے اپنی کربلا کا نام پھول کٹورہ رکھا۔ چونکہ سنیوں کا غلبہ تھا اس لئے ان کے جلوسوں کی رونق سوا ہوگئی۔ ہندو بھی اپنا تعزیہ لے کر اُن کے ساتھ مل گئے۔ یہ ۱۹۰۶ء میں شروع ہوا ۱۹۰۸ء میں شیعوں نے گورنر یوپی سے شکایت کی کہ سنیوں کا جلوس روکا جانے اور خلفائے راشدین کی مدح نہ ہو کیونکہ اس طرح ان کے جذبات مجروح ہوتے ہیں۔ گورنر نے اس کی تحقیقات وسفارت کے لیے ایک آئی سی ایس مسٹر پگٹ کی صدارت میں کمشن بنا دیا۔ جس کے ارکان میں دو ہندو، دو سنی اور دو شیعہ تھے۔ اس کمشن کی رپورٹ پر یوپی گورنمنٹ نے اس ترمیم کا اضافہ کیا کہ کسی بھی پبلک مقام پر ابوبکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ کی مدح زیر دفعہ ۲۹۸ قابل مواخذہ ہے۔ اس پابندی کے بعد شیعہ وسنی ایک ہی قوم کے دو متحارب فریق ہوگئے۔ کوئی ۲۸ برس بعد (۱۹۳۶ء) اس باب میں مسٹر اے ڈی نقوی جو لکھنؤ میں سٹی مجسٹریٹ تھے اپنے شیعہ عقائد کی وجہ سے سنیوں کی دل آزاری کا باعث ہوئے۔ انہوں نے میلاد النبی کا جلوس نکالنے اور اس میں مدح صحابہ پڑھنے کی ممانعت کر دی۔ واضح رہے کہ یہی سٹی مجسٹریٹ، پاکستان آکر کراچی کے چیف کمشنر ہوگئے ـــــ ان کی بدولت لکھنؤ میں پہلی دفعہ جن تین صاحبوں کو مدح صحابہ کے جرم میں پکڑا گیا وہ مجلس احرار کے کارکن تھے۔ ان کی گرفتاری سے عوام مشتعل ہوگئے اور سول نافرمانی شروع ہوگئی۔

۳۱ اپریل ۱۹۳۷ء کو یوپی گورنمنٹ نے الہ آباد ہائی کورٹ کے جج مسٹر جسٹس السپ کی صدارت میں اس قضیہ کا حل تلاش کرنے کے لئے کمیٹی بنائی۔ اس کمیٹی نے ۱۵ جون ۱۹۳۸ء کو اپنی رپورٹ میں سنیوں کے حق مدح صحابہ کو تسلیم کیا لیکن معاملہ عملاً جوں کا توں رہا۔ مولانا حسین احمد مدنی نے مداخلت کی اور یوپی گورنمنٹ کو احوال وکوائف کے

علاوہ نتائج و آثار سے مطلع کیا۔ لیکن بیل منڈھے نہ چڑھی۔ لکھنؤ میں ۸۰ ہزار سنی اور ۲۰ ہزار شیعہ رہتے تھے۔ شیعوں کے سال بھر میں ۴۳ جلوس نکلتے لیکن سنیوں کو ایک جلوس بھی نکالنے کی اجازت نہ تھی۔ مقامی احرار نے میلاد النبیؐ پر جلسہ کرنا چاہا لیکن پولیس نے مدح صحابہ کے خدشہ سے رکوا دیا اور یوپی کے بعض احرار زعماء پکڑ لئے۔ اس شرارت کا سرغنہ وہی ابو طالب نقوی تھا جس نے مدح صحابہ کے جرم میں کئی ہزار مسلمانوں کو جیل میں ڈلوا دیا۔ احرار راہنماؤں میں مولانا مظہر علی اظہر شیعہ تھے انہوں نے تحریک مدح صحابہ کے نام پر ایک کتاب لکھی اور سارا مسئلہ بیان کیا کہ کس قسم کے لوگ استعمار کو تقویت پہنچانے کے لئے مدح صحابہ کر رہے اور ان کے عزائم کیا ہیں؟

شاہ جی نے لکھنؤ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ چیز تو سمجھ میں آتی ہے کہ کسی کو گالی نہ دی جائے لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ فلاں کی مدح نہ کی جائے۔ اس قسم کا انوکھا قانون لکھنؤ ہی میں ہے کہ مسلمانوں کے دو فرقوں میں سے اقلیت کا فرقہ اکثریت سے مطالبہ کرتا اور قانون کی آڑ لیتا ہے کہ وہ قرن اول کے اسلام کی ان شخصیتوں کا نام نہ لیں اور نہ ان کی منقبت سنیں جو مدینہ طیبہ میں رسول اللہ کے پہلو میں سو رہے ہیں۔ مظہر علی نے کہا اگر ابوبکرؓ عمرؓ، عثمانؓ کے نام کردن زدنی ہوتے تو علی مرتضیٰ اپنے بیٹوں میں سے تین کے نام ان کے نام پر نہ رکھتے۔ یہ شیعوں کی زیادتی ہے کہ وہ کربلا کے شہداء میں ان کا نام نہیں لیتے حالانکہ ۲۰ کے قافلہ میں یہ تینوں بھائی کربلا ہی میں شہید ہوئے تھے۔

آواز آئی "مظہر علی شیعہ ہو کر کیا کہہ رہے ہو؟"

جواب دیا "وہی کہہ رہا ہوں جو حق ہے میرے پاس مولا علی علیہ السلام کی سند ہے"

## تحریک کشمیر

احرار کے عظیم کارناموں میں سے تحریک کشمیر (اکتوبر ۱۹۳۱ء) کو فوقیت حاصل ہے

جماعت احرار کے باب میں اس کا ذکر آچکا ہے۔ مزید برآں کہ یہ تحریک ریاستی استبداد کے خلاف عوامی احتجاج تھا سوال ہندو یا مسلمان نواب یا مہاراجہ کا نہیں تھا مسئلہ یہ تھا کہ ریاستیں ہندوستان میں دوہری غلامی کا جہنم تھیں۔ کشمیر کا مسلمان غایت درجہ ستایا ہوا تھا۔ مہاراجہ ہری سنگھ کے ڈوگرے مسلمانوں کو انسان ہی نہ سمجھتے تھے۔ گائے ذبح کرنے کی سزا عمر قید تھی۔ احرار نے اس تحریک کی عنان ہاتھ میں لی تو اس کے کئی وجوہ تھے لیکن کشمیری مسلمانوں کی مظلومی کے علاوہ ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ میرزائی برطانوی استعمار کے آلہ کار کی حیثیت سے آل انڈیا کشمیر کمیٹی بنا کر ایک بھیانک ڈرامہ رچا بیٹھے تھے۔

اولاً: وہ ریاست میں اپنا رسوخ و اقتدار چاہتے تھے جو کشمیر کو میرزائی ریاست بنانے کے خواب کی تعبیر تھی۔

ثانیاً: کشمیری مسلمانوں کی ہمدردی کے نام پر وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاسی زندگی میں رسائی کے خواہاں تھے۔

ثالثاً: انگریزوں نے اپنے مقاصد مشئومہ کی تکمیل کے لئے انہیں ایک آلہ کار کی حیثیت سے اس راستہ پر لگایا تھا۔

رابعاً: برطانیہ جب تک ہندوستان میں رہا اس نے روس سے خطرہ محسوس کیا۔ روس کے اس خطرے کا جائزہ لینے کے لئے اس نے بعض مسلمان فضلاء کو بھی جاسوسی پر مامور کیا۔ مثلاً پچھلے ہی دنوں شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد کے نواسے نے اپنے نانا کی ذہنی خدمات کا انکشاف کیا تھا۔ قادیان کے خلیفہ اول حکیم نورالدین مہاراجہ پرتاب سنگھ کے طبیب تھے۔ انگریزوں نے مہاراجہ پر الزام لگایا کہ وہ برطانیہ کے خلاف روسی حکومت سے خفیہ خط و کتابت کرتا ہے حکیم صاحب متعدد سالوں تک مہاراجہ کی جاسوسی کرتے رہے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ مہاراجہ نے انہیں ۱۸۹۳ء یا ۱۸۹۴ء میں مشکوک قرار دے کر نکال دیا۔

اس ضمن میں ایک قادیانی مبلغ محمد امین کا بیان جو ۲۸ دسمبر ۱۹۲۲ء کے الفضل میں طبع

ہوا۔ توجہ طلب ہے وہ لکھتا ہے کہ:

"اگرچہ میں روس میں تبلیغ احمدیت کے لیئے گیا تھا لیکن سلسلہ احمدیہ اور برٹش گورنمنٹ کا مفاد چونکہ ایک دوسرے سے وابستہ ہیں اس لیئے جہاں میں تبلیغ کرتا وہاں لازماً مجھے گورنمنٹ انگریزی کی خدمت گزاری بھی کرنی پڑتی"

اس پس منظر میں کشمیر کیمیٹی کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہیں۔ ۲۵ جولائی ۱۹۳۱ء کو اس کی بنیاد رکھی گئی میرزا بشیر الدین محمود، علامہ اقبالؒ کو ساتھ ملا کر اس کے صدر ہو گئے۔ احرار نے علامہ اقبال کو حقائق کے مطالعہ کی دعوت دی۔ آخر کار علامہ انور شاہ، سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور چوہدری افضل حق کی تحریک پر حضرت علامہ کشمیر کیمیٹی سے مستعفی ہو گئے۔

احرار نے تحریک کشمیر میں پچاس ہزار مسلمان قید کرائے ان کی اس تحریک کو ہندو کیا سمجھتے کہ مہاراجہ ہندو تھا اور ہندو من حیث الجماعت کوتاہ نظر اور تنگ دل تھے لیکن مسلمان امراء اس وقت تک تحریک کا ساتھ دیتے رہے جب تک مہاراجہ ہری سنگھ سے مقابلہ تھا جونہی احرار نے کانٹا بدلا یعنی انگریزی سیاست کا زہر توڑنے کے لیئے صوبہ میں بدیسی کپڑے اور شراب پر پکٹنگ شروع کی تو انگریزوں سے براہ راست تصادم ہوتے ہی امراء کا گروہ بھاگ گیا۔ مہاراجہ بے بس ہو گیا لیکن انگریز بھی چھٹکارا چاہتے تھے۔ انہوں نے مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید کو بیچ میں ڈالا کہ احرار سے صلح کرا دیں۔ معاملہ طے ہو رہا تھا کہ سرکاری مسلمانوں نے بیچ کا ٹنڈا ڈالا کہ اس طرح آپ پنجاب کی سیادت ان لوگوں کو دیں گے جو طبعاً انگریزوں کے خلاف ہیں۔ کچھ دیر توقف کیجئے۔ احرار کی تحریک ختم کرنا ہمارا ذمہ ہے۔ وہی ہوا میرزا بشیر الدین محمود نے شیخ عبد اللہ اور ان کے نوجوان رفقاء کو مغالطہ دے کر اپنے سانچے میں ڈھال لیا۔ اس طرح کشمیر میں ان کی معرفت احرار کی مخالفت شروع ہو گئی۔ پنجاب میں مسلمانوں کے سرکاری امراء پہلے سے ادھار کھائے بیٹھے تھے۔ تحریک کا چراغ ٹھنڈا ہو گیا لیکن کشمیر میں تحریک آزادی کو نشوونما حاصل ہوئی۔ گلانسی کمشن بیٹھا جس نے کشمیر میں ذمہ دار حکومت

دونوں حصے ایک حکومت کے تحت رہ سکیں گے ضرور جدا ہونگے قائد اعظم کے بعد پاکستان میں لیگ کی صفوں میں سے کسی فعال لیڈر شپ کا ملنا اور اٹھنا محال ہے۔ ملک جذبات سے کہیں زیادہ حقائق پر چلتے ہیں جو مسئلہ آج لیگ اور کانگرس کا ہے وہ کل ہندوستان اور پاکستان کا ہو جائے گا۔ عجب نہیں دونوں ملک بین الاقوامی طاقتوں کا مہرہ بن جائیں اور ان کی باہمی چپقلش سے دونوں مملکتوں کے سر پہ ہر لحظہ جنگ کا خوف مسلط ہو۔

احرار اپنے طبقاتی مزاج کے مطابق ملک کی سیاست کو مسلمانوں کے طبقہ امرار کی سیاست قرار دیتے اور گفتنی و ناگفتنی سب کہہ جاتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ملک کی تقسیم سے کہیں انسب دولت کی تقسیم ہے۔ اس غرض سے وہ ہندوستان کے دو ٹکڑے نہیں کئی ٹکڑے کر دینے کے حق میں تھے لیکن اسلام کا نام لے کر کسی ٹکڑے میں کسی یزید جیسے سلطان کے لئے تخت سلطنت بچھانے کے حق میں نہ تھے۔ ان کے نزدیک ایسا سوچنا یا کرنا اسلام سے غداری کے ہم معنی تھا۔ چودھری افضل حق نے احرار کو ۱۹۴۱ء میں مشورہ دیا تھا پاکستان کے نعرے کی مخالفت نہ کرنا یہ دکھی دلوں کی آواز ہے اگر مخالفت کی تو جان لیوا قسم کی ایک اور شہید گنج آگرے گی۔ احرار نے عمل نہ کیا اور کئے دھرے کی سزا پائی۔ مولانا مظہر علی اظہر نے متحدہ ہندوستان کے آخری انتخابات (۱۹۴۶ء) میں حصہ لے کر احرار کی شہ رگ کٹوا دی۔ مولانا مظہر علی حدود اختلاف سے تجاوز نہ کرتے اور اپنی جنگ کو محض سیاسی رہنے دیتے تو احرار اپنے اختلاف کے باوجود لیگ کے بعد پاکستان کی دوسری بڑی جماعت ہوتے۔

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی دوسری جنگ عظیم تک احرار کے صدر رہے۔ وہ اپنے ساتھیوں میں سب سے زیادہ کانگرس کے قریب تھے ان کے امام و پیشوا مولانا ابو الکلام آزاد تھے اس کے برعکس مولانا مظہر علی اظہر احرار میں کانگرس کے سب سے بڑے مخالف تھے لیکن قائد اعظم کو جلسہ عام میں کافر اعظم کہہ کر اور ان کی اہلیہ کے متعلق نکاح سے

محرومی کا فرنتی الزام لگا کہ انہوں نے احرار کو مصیبت میں ڈال دیا۔ مظہر علی کے اس الزام اور تبریٰ سے کوئی خوش نہ تھا۔ شاہ جی نے سری نگر سے واپس آتے ہی مظہر علی کو مطعون کیا کہ ایک عفیفہ عورت کے متعلق انہوں نے یہ شوشہ کیوں چھوڑا؟ اور ساتھ ہی بھری مجلس میں فرمایا کہ مظہر علی تم ہار گئے ہو۔

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی تقسیم کے بعد دہلی میں آباد ہو گئے اور وہیں مر کے دفن ہوئے۔ ان کے صاحبزادے مولوی عزیز الرحمٰن نے جنوری ۱۹۶۱ء میں والد کے سوانح حیات شائع کئے اور کانگرس ہی کے ذہن کو ملحوظ رکھا۔ لیکن ان سوانح کے مشمولہ خطوط میں ایک خط پنڈت جواہر لال نہرو کے نام ہے۔ یہ خط مولانا نے ۲ فروری ۱۹۳۷ء کو تحریر کیا اس میں دوسری چیزوں کے علاوہ درج ہے کہ:

"آپ کی ایک تقریر کا خلاصہ جو آپ نے بمبئی میں مسٹر جناح کے خلاف کی ہے میری نظر سے گزرا۔ ہندوستان کے تمام مسلمانوں نے اس پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ مسلمان اخباروں نے آپ کے خلاف ایڈیٹوریل لکھے ہیں۔ ہمیں خود مسٹر جناح سے بیسیوں باتوں میں سخت اختلاف ہے لیکن ان کا ہندوستان میں کوئی مخالف ہو یا موافق؟ ہر شخص انہیں دیانتدار سمجھتا ہے۔ گورنمنٹ مسٹر جناح کو کسی قیمت پر خرید نہیں سکی۔ مرکزی اسمبلی میں کانگرس کی کامیابی مسٹر جناح کی رفاقت پر مبنی رہی ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

نہرو رپورٹ میں ہمیں کیوں ناکامی ہوئی صرف اس لئے کہ کلکتہ کنونشن میں مسٹر جناح سے نازیبا سلوک کیا گیا۔ آپ آج اسی تاریخ کو پھر دہرا رہے ہیں؟ مسٹر جناح سے بہتر آدمی ملنا محال ہے، ان کو قریب لانے کی کوشش کیجئے۔"

احرار کی جدوجہد سے ملک و قوم کو جو کچھ ملا وہ تجزیہ کی ابتدائی بحث میں آچکا ہے فی الجملہ احرار برعظیم کے پاکستانی علاقے کی سیاسی بیداری کا نصف اول تھے ان کے ہاتھ میں اقتدار آتا تو ملک کا سیاسی نقشہ مختلف ہوتا۔ لیکن تاریخ انسانی کا مزاج ہی کچھ ایسا

سوال صحیح یا غلط کا نہیں بلکہ امر واقعہ کا ہے۔

اس پاکستان میں خاکسار تحریک علامہ مشرقی کی وفات کے بعد ان کے بیٹے کی سیادت میں آگئی لیکن بہمہ وجوہ وہ دستبردار ہوگئے۔ بالفاظ دیگر بھاری پتھر تھا اٹھ نہ سکا۔ چوم کے چھوڑ دیا۔ خدائی خدمت گار تنظیم، پختون زلمے کے نام سے خان عبد الغفار خان کے فرزند خان عبد الولی خان کو منتقل ہوگئی کہ ان کے والد جس ملک کے لئے آزادی کی طویل جدوجہد کرتے رہے اس ملک میں ان کا رہنا اجیرن ہوگیا اور وہ بڑھاپے میں افغانستان چلے گئے اور اب کئی سال بعد آخری عمر میں لوٹ آتے ہیں۔

مجلس احرار اسلام حقیقتہً چند استعمار دشمن اور ہم خیال دوستوں کا مجموعہ تھی۔ اس کا دماغ افضل حق، اس کی زبان سید عطاء اللہ شاہ بخاری، اس کا دل حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور اس کی آنکھ مظہر علی تھے۔ چودھری صاحب ۱۹۴۲ء میں اللہ کو پیارے ہوگئے۔ ان کی اولاد نے سیاست احرار کا پنڈ چھوڑ دیا۔ مظہر علی کے بیٹے بھی افضل حق کے بیٹوں کی طرح اعلےٰ تعلیم یافتہ تھے لیکن وہ سیاست کی دوسری راہوں پر آگئے۔ مولانا حبیب الرحمٰن چونکہ ہندوستان میں آباد ہوگئے لہذا ان کے فرزند اپنے سیاسی مذاق کی بدولت بھارت میں رہنے لگے۔ ان کے ایک فرزند مولانا عزیز الرحمٰن جامعی نے اپنے والد مرحوم کے سوانح حیات لکھے ہیں لیکن ان کا استدلال ہندوستان کی آب و ہوا کے مطابق ہے۔ اس کتاب میں وہ احرار اسلام کے نہیں اپنے والد کے نمائندہ ہیں اور اسلام کا لفظ پاکستان کے احرار کی نذر کر دیا ہے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے فرزند سید ابوذر بخاری آجکل مجلس احرار کے ناظم اعلےٰ (جنرل سیکرٹری) ہیں انہوں نے احرار راہنماؤں کی تحریریں اور جماعت کی تاریخ کے گمشدہ اجزا جمع کر کے شائع کئے ہیں لیکن ہر کتاب کے ابتدائیے اکثر تاریخ کی ترازو سے نکل گئے ہیں جس سے کئی چیزیں ہلی ہوئی نظر آتی ہیں۔ جب اثاثہ کی بنیاد میراث پر ہو تو قدرتاً بعض چیزیں یکطرفہ ہو جاتی ہیں۔ بہرحال ان عزیزوں کے مواد سے راقم نے معتد بہ فائدہ اٹھایا ہے لیکن

ان کے استدلال سے اپنی راہ الگ نکالی ہے اور ان کے لہجہ سے بھی اجتناب کیا ہے۔

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے ان جلیل القدر فرزندوں کے علاوہ احرار کے ایک آدھ کارکن نے شاہ جی کے سوانح مرتب کئے اور خطبات جمع فرمائے ہیں۔ لیکن جن صاحب نے سوانح لکھے ہیں وہ لکھنا جانتے ہی نہیں جو کچھ ان کے نام سے لکھا گیا وہ اس کے پڑھنے سے بھی معذور ہیں۔ اس سوانح عمری کا تین چوتھائی الفاظ و مطالب کا کوڑا کرکٹ ہے۔ ایسا ہی مذاق خطبات امیر شریعت میں ہے۔ مرتب نے ثریا کو ثریٰ میں ڈال دیا ہے۔

احرار کی تحریکیں اصلاً اس کتاب کا حصہ نہیں اُن کی تاریخ اور تجزیہ ایک علیحدہ کتاب کا مضمون ہیں چونکہ شاہ جی نصف احرار تھے اور کوئی سی جماعتی تحریک ان کے بغیر متحرک نہ ہوتی اس لئے زیر نگاہ باب مندرجہ بالا عنوان کے تحت مختصراً قلمبند کیا ہے۔ مؤلف

---

کہہ سکتا ہوں لیکن بہرحال انسان جتنا پیچیدہ ہے اتنا ہی سہل ہے۔ وہ کھلی کتاب کی طرح سمجھ میں آتا ہے ـــــ شاہ جی کے ساتھ راقم نے ملک کے بہترین اور بدترین دن گزارے ہیں اور یہ دن سالہاسال کی یکجائی رکھتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ راقم کے مشاہدہ و تجربے میں بہت سی شخصیتوں کا سونا ـــــ ملمع سے بھی کمتر قیمت کی دھات نکلا۔ لیکن جن شخصیتوں نے راقم کے افکار و سوانح کا رُخ بدل ڈالا ان میں شاہ جی ایک ایسی شخصیت تھے کہ بلاشبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ قرن اول میں ہوتے تو عشرہ مبشرہ میں ہوتے۔ راقم نے انہیں ہر لحاظ سے ایک سچا اور کھرا انسان پایا وہ اس عہد میں قدرت کا عطیہ تھے وہ نہیں جانتے تھے کہ غیبت کیا ہوتی ہے؟ اور جھوٹ بول کر زندگی کیونکر بسر کی جاتی ہے؟ یہ بات پہلے بھی کہیں آچکی ہے کہ وہ دو گروہوں کے دشمن تھے۔ اولاً انگریزی حکومت اور اس کے خوشہ چینوں کے، دوم میرزائی نبوت اور اس کے اعضاء و جوارح کے۔ لیکن ان کے متعلق بھی کبھی کسی افتراء و کذب کے مرتکب نہ ہوتے جو بات حقیقت ثابت ہوتی وہی بیان کرتے۔ کئی لوگ جن سے قومی گناہ سرزد نہ ہوئے تھے لیکن ان کے خیالات دوسرے تھے۔ وہ ان کے ذاتی دوست تھے۔ کوئی رفیق سفر اُن کے متعلق سخت سست کہتا تو سختی سے روک دیتے۔ بھائی! جانے دو، وہ میرا دوست ہے۔ ان کی یہ عادت نقص کی حد تک چلی گئی تھی کہ دوستوں کے عیب چھپاتے تھے۔ فرماتے بھئی اللہ تعالیٰ ستار بھی ہیں غفار بھی اور رحیم بھی، ہم ان کے بندے ہیں ہمیں سنت اللہ پر کاربند ہونا چاہیئے۔

شاہ جی دعوت و تذکیر کے باب میں متشدد نہ تھے فرماتے جن لوگوں نے قرن اول سے لے کر اب تک اسلام قبول کیا وہ محض گفتار سے متاثر نہ ہوئے تھے انہیں داعیوں کے کردار نے متاثر کیا اور وہ مسلمان ہو گئے ـــــ فرمایا اچھی تعلیم تو ہر مذہب میں مل جاتی ہے اصل مسئلہ اس تعلیم کی اساس اور تربیت پر انسانوں کے معاشرہ کا ہے۔ اسلام نے اُونچ نیچ ختم کی، غریبوں کو سرداری بخشی، ہزاروں خداؤں سے نجات دلائی۔ ایک خدا

کا بندہ بنایا اور خدا ابھی ان دیکھا کہ ہماری آنکھیں اس خدا کو دیکھ نہیں سکتی ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ ساری خدائی میں اسلام پھیلنے لگا۔ یہ گڈریوں کی جہانبانی کا اعجاز تھا کہ نصف کائنات مسلمانوں کے زیر نگیں ہو گئی ۔۔ لیکن اب مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ وہ سیاسی مسلمان ہو گئے ہیں۔ خود علماء کو اپنے فرائض و مناصب کا احساس نہیں رہا۔ غیروں کو مسلمان بناتے بناتے مسلمانوں کو کافر بنانے کی تحریکیں چلا دی ہیں۔ ہندوستان میں یہ فصل انگریزوں نے کاشت کی۔ پہلے لوگ اہل اللہ کی نگاہ سے مسلمان ہوتے تھے اب اہل علم کی زبان سے کافر ہو رہے ہیں۔ شاہ جی کو ہمیشہ قلق رہا کہ سیاست دانوں نے تبلیغ اسلام کی رفتار روک دی ہے اب کوئی مسلمان نہیں رہا اور جو مسلمان ہوتا ہے وہ سیاسی طور پر مسلمان ہوتا یا معاشی ضرورت کھینچ لاتی ہے یا پھر عشق و نفس کی مہربانی ہوتی ہے۔

۱۹۳۹ء کے ابتدائی مہینوں کا ذکر ہے بمبئی میں احرار کانفرنس تھی۔ حافظ علی بہادر مرحوم نے بڑے ٹھاٹھ کا انتظام کیا۔ راقم کے چند احباب جو وہاں فلم انڈسٹری میں کام کرتے تھے اور قدرت نے انہیں پنجابی حسن دے رکھا تھا۔ راقم کو ملنے آتے۔ راقم نے شاہ جی کو بھی ملایا، شاہ جی نے ان سے محفل جمالی اور زمانہ بھر کی باتیں زیر بحث آگئیں۔ ایک نوجوان نے جو کسی فلم میں سائیڈ ہیرو تھا شاہ جی سے کہا۔

” ہندو مسلم اتحاد ناقابل عمل ہے“۔

شاہ جی نے کہا۔

” ہاں بھائی تم بھی ٹھیک کہتے ہو، واقعی اتحاد سے بڑھ کر خطرناک چیز کوئی نہیں البتہ پیٹ کے لئے ہو تو خطرناک نہیں آزادی کے لئے ہو تو خطرناک ہے۔ فلمی صنعت میں ہیرو ہندو ہو اور ہیروئن مسلمان، تو وہ اتحاد قابل عمل ہے لیکن قومی سیاست میں عطاء اللہ شاہ، جواہر لال سے قدم ملا کے چلے اور مقصود انگریزوں کی غلامی ختم کرنا ہو تو اس سے بڑھ کر بھلا کیا چیز خطرناک ہو سکتی ہے۔ پہلی جنگ عظیم میں انگریزی فوج کے ہندو اور مسلمان سپاہیوں نے

دعوت یا پیام کے بغیر تقریر اس کے سوا کچھ نہیں کہ الفاظ کا نخرہ ہے۔

بعض سوالوں کے جواب میں فرمایا۔

خطابت ابلاغ کی معراج کا نام ہے جس سے دماغوں میں افکار کو راہ ملتی اور دلوں میں تحریک پیدا ہوتی ہے تقریر الفاظ و مطالب کی میناکاری ہے — وعظ عقیدہ کی آبیاری ہے پارلیمانی تقریر افہام و تفہیم کی نمائش ہے۔ مذاکرے یا مباحثے افکار و اذہان کی شطرنج ہیں۔

پبلک سپیکنگ کے متعلق فرمایا۔ کہ شعلہ و شبنم کا آمیختہ ہے اور اس میں وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو لوگوں تک پہنچ سکتے ہیں۔ انسانوں کے سر اکھٹے کر کے ان کے قدم ملا دینا خطابت کا منتہیٰ ہے۔

خطابت کے بارے میں شاہ جی کے یہ خیالات حافظ کی یادوں سے ماخوذ ہیں۔

انہوں نے خطابت کی وادی میں چالیس برس سفر کیا اور لاکھوں فقرے زبان و بیان سے نکلتے رہے۔ ان کے شرکار سفر میں کوئی صاحبِ قلم ہوتا تو نطشے کی تالیف "بہ قول زردشت" کی طرح ایک ایسی کتاب تیار ہو جاتی کہ اردو خطابت صدیوں ناز کرتی۔ افسوس ان کے افکار و کلام کا وہ سرمایہ ہواؤں میں گھل مل گیا۔ نتیجتہً قرطاس و قلم خالی رہ گئے — بہرحال اپنی یادداشتوں اور دوستوں کی روایتوں سے چند کلمات نذر قارئین ہیں فرمایا۔

● عمر بھر مسلمانوں کے دروازے پر دستک دیتا رہا جواب نہ آیا۔ سوچتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی اجتماعی سرشت بوڑھوں کی ہمت، بچوں کی ضد، اور عورتوں کی عقل سے تیار ہوئی ہے۔

● میرے اعضا نے مجھ سے بغاوت کر دی ہے، ہمت نہیں کہ آپ سے خطاب کروں، ساری عمر کی پونجی وہ نوجوان ہیں جو گھر سے اٹھا کر مجھے یہاں لے آئے۔ حقیقتاً یہاں سزا کے طور پر کھڑا ہوں۔ ان نوجوانوں نے سزا دی ہے اور میں نے وہ سزا قبول کر لی ہے۔

○ ہم دونو بیمار ہیں۔ آپ بھی بیمار رہیں بھی بیمار رہوں۔ مجھے سچ بولنے کا عارضہ ہے تمہیں سچ نہ سمجھنے کی بیماری ہے ــــ آئیے دُعا کریں کہ اللہ تعالیٰ دونو کو شفا دے ورنہ ــ ع

جی کا جانا ٹھیر گیا ہے صبح گیا یا شام گیا

○ میں بیان کرتا ہوں بیان نہیں دیتا۔ میری ساری زندگی کا خلاصہ یہی ہے، مسلمانوں کی تاریخ کے بالاستیعاب مطالعہ نے مجھے یہ رائے قائم کرنے میں بڑی مدد دی ہے کہ ان کی پوری تاریخ کا لب لباب یہ ہے کہ وہ ڈنڈے والے کے آگے آگے اور پیسے والے کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں۔

○ شاہ جی کے چل چلاؤ کا زمانہ تھا اکثر و بیشتر محسوس ہوتا دل گرفتہ ہیں۔ ایک دن کسی نے کہا شاہ جی اس قوم نے آپ کو کچھ نہیں دیا؟

فرمایا۔ پہلے کس کو دیا ہے کہ مجھے دیتی میں نے جو کچھ کیا اللہ کے لئے کیا۔ ایک صاحب بولے۔

بہر حال اتنی طویل جدوجہد کا صلہ یہ ہو تو شکستیں دل پر داغ چھوڑ جاتی ہیں۔

فرمایا۔

" مجھے اپنی قوم سے کوئی اُمید نہ تھی اگر وہ بہتر سلوک کرتی تو حیرت ہوتی اس قوم نے میرے باپ سے جو کربلا میں کیا اور میرے نانا سے جو مکہ میں کیا وہ گویا میرا ورثہ تھا اس قوم کو وہی کرنا چاہیئے تھا جو میرے خاندان سے کر چکی اور میرے اسلاف سے کرتی رہی ہے۔ جو کچھ میرے ساتھ ہوا اس سے مطمئن ہوں سلوک مختلف ہوتا تو متعجب ہوتا۔ البتہ اس قوم کے انجام سے متفکر ہوں مبادا یہ قوم ــ برعظیم سے محروم ہو جائے۔

○ سلطان ابن سعود نے حجاز میں جلسے کروانے شروع کئے تو برعظیم کے ان علماء و مشائخ نے آسمان سر پہ اُٹھا لیا جن کے پیروؤں نے ان سے تعویذ لے کر زندہ عربوں کو

کانٹے ہیں وہ یاد فرمائیں سر کے بل جاؤں گا۔ سمجھا دیا تو وہ آرام سے بیٹھیں ان کی لڑائی خود لڑوں گا۔ لیکن وہ ہم سے بات نہیں کرتے صرف بیعت چاہتے ہیں۔

مجمع دیہاتی تھا قائد اعظم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا ے

میری گھگھری نوں گھنگر ولوا دے
جے تو میری ٹور دیکھنی !

اور شرح یہ کی پاکستان کا اَور چھوڑ تبادو عوام کے ہر محاذ پہ جاؤں گا اور لڑوں گا۔

ایک ٹھیٹھ پنجابی گاؤں میں معراج النبیؐ پر تقریر کر رہے تھے، فرمایا۔

حضورؐ معراج کو چلے تو کائنات رُک گئی۔

سوچا کہ دیہاتی سمجھ نہیں سکے کہ کائنات رُک گئی کے معنی کیا ہیں، پوچھا۔

کچھ سمجھے ؟ مجمع نے کہا—— جی نہیں۔

بہت سمجھایا لیکن اُردو اور پنجابی کے متبادل فقروں سے بات نہ بن سکی۔ کروٹ لی۔

"کہ سوہنا اپنے عاشق دل چلیا تے زمین و آسمان ٹھہر گئے"—— کیوں ؟ آواز کا رس گھلاتے ہوئے یہ لحن سے

تیرے لونگ دا پیا لشکارا
تے ہالیاں نے ہل ڈک لئے

مجمع پھڑک اُٹھا۔ آوازیں آئیں شاہ جی سمجھ گئے۔ اور یہ تھا خطابت کا اعجاز۔

O

جن دنوں وزارتی مشن دہلی پہنچا شاہ جی اور احرار کی عاملہ کے ارکان دہلی میں تھے اور اس وقت تک دہلی میں ہی رہے جب تک مشن انگلستان لوٹ نہیں گیا۔

دو اڑھائی مہینے کی ان صحبتوں میں شاہ جی کا بالراست مطالعہ کیا تو ان کی طبیعت کے مختلف پہلو اپنی خصوصیتوں سمیت ظاہر ہو گئے تمام دن لوگ چلے آتے مختلف موضوعات

وصل کی شب، اور ان کا کہنا

جاؤ بھی ہم نہیں منتے

عوام سمجھ لیتے اور بات ادھوری نہیں رہتی۔ دو مصرعوں میں پوری کہانی لپٹی ہوتی ہے۔

اِن دنوں شاہ جی کی بدولت مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا ابو الکلام آزاد اور بعض دوسرے مشاہیر سے ملنے کا مفصل موقع ملا۔ ان سے یہ پہلی ملاقاتیں نہ تھیں لیکن شاہ جی سے ان کے تعلقات کا اندازہ ہوگیا۔ ان نجی محفلوں سے بعض ایسی باتیں معلوم ہوئیں جو اکثر و بیشتر عوام میں نہیں آتی ہیں۔

مہاتما گاندھی نے عزیز الرحمٰن کی معرفت انہیں یاد کیا اور وہ تاریخ مقررہ پر ان کے ہاں آدھ گھنٹہ رہے۔ شاہ جی سے بڑھ کر وقت کا دشمن کوئی نہ تھا وہ اس باب میں کسی پابندی کو ملحوظ نہ رکھتے۔ گاندھی جی کے ہاں پہنچے تو ٹھیک وقت پر لیکن وہاں ملکی مسائل کے بجائے سورۂ اخلاص کی تفسیر لے بیٹھے۔ گاندھی جی اپنی پرارتھنا میں علاوہ اپنی دعاؤں کے سورہ اخلاص اور سورہ فاتحہ پڑھتے تھے۔ شاہ جی نے کہا ان سورتوں کے معنی میں آپ کس کے ترجمہ پر انحصار کرتے ہیں؟ گاندھی جی نے کہا — دونو سورتوں کے معنی بیان کرتے وقت مولانا ابو الکلام آزاد کا ترجمہ ملحوظ رکھتا ہوں — فرمایا شاہ عبد القادر کا ترجمہ دیکھا ہے کہنے لگے ہاں، فرمایا — انہوں نے سورۂ فاتحہ کا جو لفظی ترجمہ کیا ہے وہ زیادہ سہل ہے۔ غرض اس بیان و کلام میں انتیس منٹ نکل گئے، ایک منٹ باقی تھا ہم چاہتے تھے کہ شاہ جی گاندھی جی سے پیش آمدہ مسائل سے متعلق معلوم کریں کہ وزارتی مشن سے گفتگو کس مرحلے میں داخل ہوئی ہے لیکن وہ ترجمہ کی بحث کو چھیڑ کے بیٹھ گئے۔

عزیز الرحمٰن نے کہا۔ شاہ جی وقت ہوگیا ہے۔

شاہ جی نے فرمایا — چھوڑو میرے اور مہاتما جی کے درمیان کوئی وقت نہیں۔ پورے

طرف سے ہے۔ فرمایا اسکیم تو میری ہے لیکن کانگرس معترض نہ ہوگی۔ ہو سکتا ہے ایک ذہن مخالف ہو اس کے پیش نظر مدت سے تقسیم ملک پر اصرار ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس طرح ہمیشہ کے لیئے ہندو مسلم قضیہ ختم ہو جائے گا لیکن تقسیم صرف ہندوستان کی نہ ہوگی پاکستان بھی تقسیم ہوگا۔ اور اگر یہ دونو ملک تقسیم ہو کر آزاد ہوئے تو ان میں شانہ بشانہ ہونے کی وجہ سے ہمیشہ جنگ کی سی حالت رہے گی تا آنکہ کوئی اور شکل نمودار ہو۔

۲۔ انگریز فی الواقعہ ہندوستان چھوڑ رہا ہے اب نہ اس کے اقتدار کا ہندوستانی نقشہ بحال رہا ہے اور نہ بین الاقوامی حالات اس کے موافق ہیں۔ ہم چاہیں بھی تو وہ ہندوستان میں ٹھہرنے کے لیئے تیار نہیں۔

۳۔ مسلمانوں نے میرے سیاسی موقف کو مسترد کر دیا مسٹر جناح نے مسلمانوں کی عصبیت کو اتنا مضبوط کیا ہے کہ اب وہ اس کے خلاف کوئی سی رائے قبول کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ میں چاہتا ہوں مسلمان اپنی انفرادیت کو مشخص کر لیں اور جو کچھ بھی ہو وہ انگریزوں کی معرفت نہ ہو، ہندوؤں کو بہ دلیل راضی کر کے ہو، گاندھی و نہرو غیر مخلص نہیں اگر بر عظیم کی آزادی نفرت کی موجودہ لہروں سے نکلی تو اس کے نقصانات بہت زیادہ ہوں گے۔ سب سے بڑا نقصان یہ ہوگا کہ ہندوستان کا مسلمان اپنا وجود کھو بیٹھے گا۔ پھر پاکستان کی داخلی حالت ان کو بچا نہ سکے گی۔ مجھے تقسیم کی صورت میں دور تک کشمکش نظر آتی ہے۔ اندرون پاکستان بھی اور پاکستان سے باہر بھی۔

۴۔ راقم نے عرض کیا موجودہ ادب سے متعلق آپ کا ارشاد کیا ہے؟ فرمایا تحریک ادبی ہو یا سیاسی سفر میں اسی قسم کے موڑ آتے ہیں۔ جب ملک میں چاروں طرف افراتفری چھا گئی ہو تو ادب جو معاشرہ کا عکس ہوتا ہے اس سے مختلف نہیں ہوتا اور نہ ہو سکتا ہے۔ بہر حال یہ ادب دائمی نہیں اس ادب کا مزاج سیاسی ہے اس کے لہجہ میں جھنجلاہٹ ہے اور یہ ایک طبعی چیز ہے جب یہ دور لد جائے گا تو ادب کی چمن بندی میں خار و خس نہیں رہیں گے۔

ہم شاہ جی کی باتوں کو مجذوب کی بڑ سمجھتے لیکن ان کی تمام باتیں سچی ہوتی گئیں۔ فرمایا۔

۱۔ چاروں طرف آگ لگی ہوئی ہے، ماں بیٹی، باپ بیٹا اور بہن بھائی کے رشتے ٹوٹ گئے ہیں۔ دریاؤں میں خون ہے، ہواؤں میں دھواں، دھرتی طوطا چشم ہو گئی ہے اور وہی ہو کے رہا۔

۲۔ سیاست دانوں نے جغرافیائی نقشہ اٹھا کر اس پر ضرب و تقسیم کی ہے لیکن اس کی بدولت بڑی مدت کے لئے انسان مر گیا ہے۔

۳۔ برّ عظیم میں تبلیغ کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا ہے۔ ہم نے سیاسی حقوق کے حصول کی خاطر دینی فرائض سے بغاوت کرا دی ہے۔

۴۔ پاکستان سیاسی یزیدوں کی آماجگاہ بن کے رہے گا۔

۵۔ احقر کے ایک اداریہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا تم نے ٹھیک لکھا ہے کہ ہندوستان میں مسلمان اور پاکستان میں اسلام نہیں رہے گا، لیکن اسلام نہ رہا تو پاکستان کہاں ہو گا؟

مسٹر پربودھ چندر ۱۹۶۰ء میں دہلی سے لاہور آئے تو شاہ جی سے ملنے ملتان گئے۔ شاہ جی سے کہا۔

"پنڈت جی سلام کہتے تھے اور ہاں اندرا نے بھی سلام کہا ہے"۔ شاہ جی غوطہ کھا گئے۔ تھوڑی دیر چپ رہے پھر فرمایا۔

بھائی! پنڈت جی سے کہنا جس عطاء اللہ شاہ کو آپ جانتے تھے وہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو مر گیا تھا۔ البتہ اندرا کو سلام و دعا کہنا کہ وہ بیٹی ہے۔